www.urducouncil.nic.in

مئی 2018، قیمت :- /10₹

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

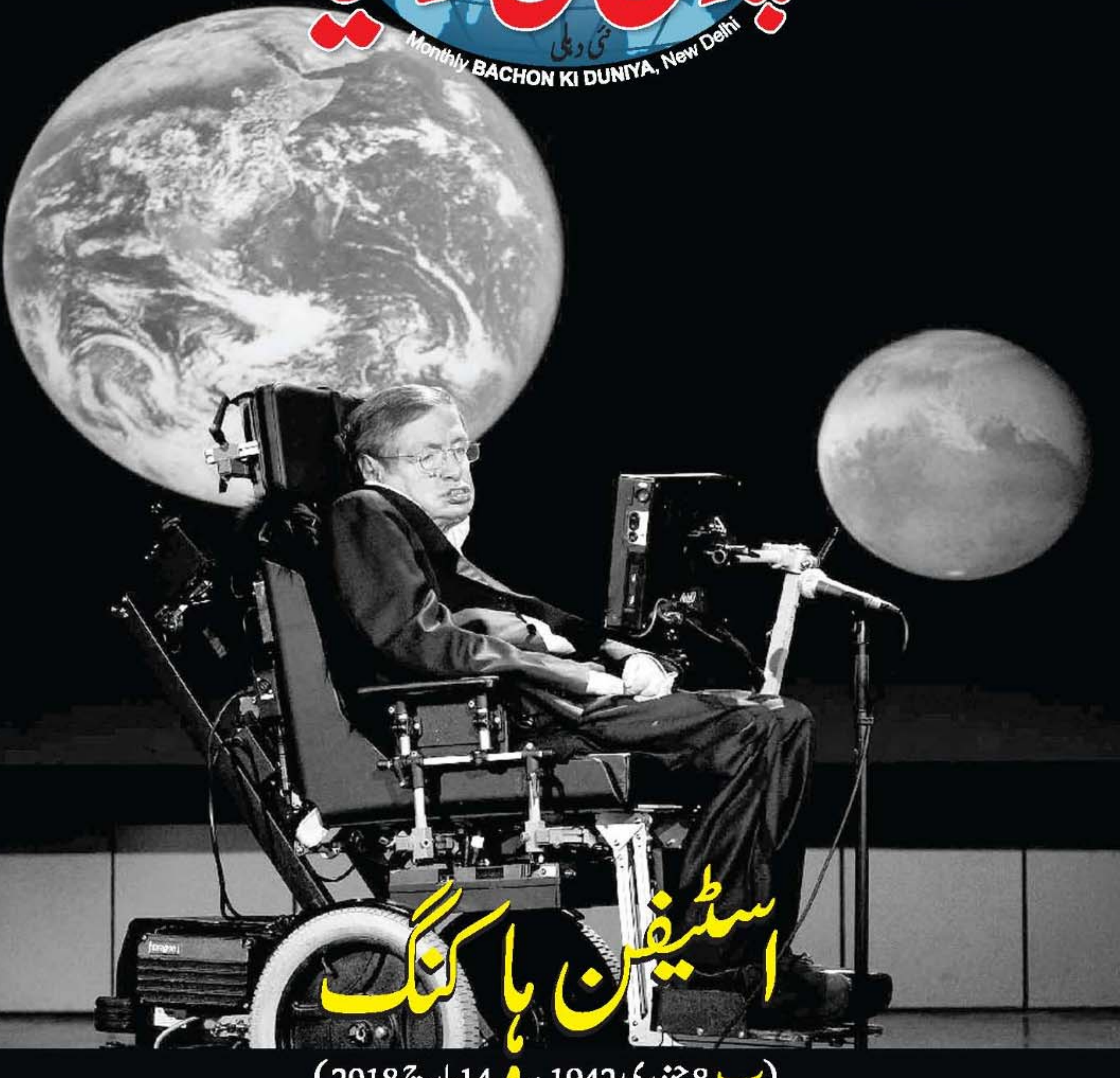

اسٹیفن ہاکنگ

(پ 8 جنوری 1942 ، و 14 مارچ 2018)

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے ،اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد: 6 شمارہ: 5 مئی 2018

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل۔ محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،

جسولہ، نئی دہلی- 110025

فون: 49539000

شعبہ ادارت: 49539009-11

ای میل

bachonkidunlya@ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ /100 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم

نئی دہلی- 110066

فون: 26109746

ای میل: sales@ncpul.in

ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد- 500002

فون: 040-24415194

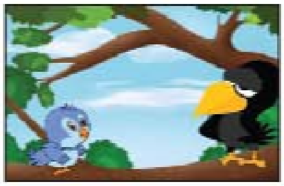

مدیر کا خط	آپس کی باتیں		04
بڑوں کی باتیں	ڈاک خانہ		05
گوشۂ ہاکنگ	اسٹیفن ہاکنگ	امجد اسلام امجد	06
	اسٹیفن ہاکنگ 76 برس میں		
	صدیوں کا سفر	منور حسن کمال	08
	اسٹیفن ہاکنگ سے ملیں	عظیم اقبال	11
	اسٹیفن ہاکنگ		14
	اسٹیفن ہاکنگ کے ساتھ		
	وقت میں سفر	ترجمہ و تلخیص: سہارا	17
نظمیں	الفت کا پیڑ	غضنفر	22
	رمضاں آیا رمضاں آیا	ام حبیبہ لکھنوی	23
مضامین	رزرو بینک	غلام حیدر	24
	ہم سے بھی ملاقات کریں	شمیم احمد صدیقی	27
کہانیاں	کوے کے پر	محمد سراج عظیم	30
	بولنے والی رضائی	اردو ترجمہ: ذاکر فیضی	34
	حکمت سے مسائل حل ہوتے ہیں	سیدہ نوشاد بیگم محمود	36
نظم	سبھی طفل کو ماں ملے یہ دعا ہے	محمد وکیل	38
باتصویر کہانی	طوطا کہانی	محسن خان	39
قسط وار ناول	زمین کی تہہ میں	شکیل صدیقی	44
کہکشاں	سپر بلیو بلڈ مون اور چاند گہن	انصاری اسما	53
	سیکڑوں ایجادوں		
	کا موجد: تھامس ایلوا ایڈیسن	محسن رضا	54
	شیر شاہ سوری	قاضی ضیا عالم کوسگوی	55
	مہکتی کلیاں	انصاری تحریم	56
	پھول	عرشیہ بی صابر بیگ	56
	میں کون ہوں؟	قریشی شارز شیرین نعیم اختر	56
	سنہرے حروف	روبینہ فردوس ساجد حسین	57
	سنہری باتیں	شیخ عاطف محمد	57
ننھے فنکار	ہاتھی سے جنگ	گلزار احمد	59
	بچوں کی پینٹنگ		60
آپ کی باتیں	اردو فیس بک		62

آپس کی باتیں

دوستو! 'بچوں کی دنیا' کے اِس شمارے کے ساتھ ہی 'بچوں کی دنیا' نے اپنے کامیاب پانچ سال مکمل کر لیے ہیں۔ ان پانچ برسوں میں آپ سب نے جس طرح 'بچوں کی دنیا' کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے ہم آپ کے شکرگزار ہیں۔ ہم نے بھی 'بچوں کی دنیا' کو آپ کی پسند اور عصری تقاضوں کے مطابق سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے ایسے موضوعات پر تحریریں شائع کی ہیں جو آپ سب کو پسند آئیں۔

ہماری کوشش رہی ہے کہ ہم ایسی تحریریں شائع کریں جن سے آپ کو کچھ سیکھنے، زندگی میں آگے بڑھنے اور خوب سے خوب تر کرنے کا حوصلہ ملے۔ خدا نے ہم سب کو ایک جیسی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اب یہ ہمارے اوپر ہے کہ ہم اپنی ان صلاحیتوں کو کس قدر بڑھاتے ہیں اور کس طرح اس کا استعمال کرتے ہیں۔

آپ سب جانتے ہیں کہ ہماری دنیا بہت پرانی ہے اور اسے ترقی یافتہ بنانے میں ہمارے آپ کے جیسے لوگوں کا ہی ہاتھ رہا ہے۔ پرانے زمانے سے ہی انسان اپنے شوق اور تجسس کی بنا پر اس دنیا کو ایجادات کی شکل میں نادر و نایاب چیزیں دیتا رہا ہے۔ اس کائنات کو سمجھنے اور انسانوں کو ترقی یافتہ اور باشعور بنانے میں سائنس کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ سائنس کی بدولت ہی آج ہم ہر شعبۂ زندگی میں آرام و آسائش اور سہولیات سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ سائنس دانوں کی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح دوسرے شعبوں مثلاً کھیل، فلم، تعلیم وغیرہ میں بھی عظیم شخصیات کا اہم رول ہے۔ یوں تو ایک عام صحت مند انسان بھی اپنی تھوڑی سی محنت سے کامیاب ہوسکتا ہے لیکن اس دنیا میں ایسی سیکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ معذور انسانوں نے عزم و حوصلے کی ایسی کہانی لکھی جو رہتی دنیا تک بھلائی نہیں جاسکتی۔ ان انسانوں میں سے ہی ایک تھے اسٹیفن ہاکنگ جن کی کہانی ایسی ہے جسے پڑھ کر ہم سب کو حوصلہ ملتا ہے اور زندگی میں کچھ کر گزرنے کا عزم پیدا ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ہی ان کا انتقال ہوا ہے۔ انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے 'بچوں کی دنیا' کے اس شمارے میں اس عظیم سائنس داں پر ایک گوشہ پیش کیا جارہا ہے۔ آپ سب اس عظیم سائنس داں کی کہانی پڑھیں اور خدا کا شکر ادا کریں کہ اس نے آپ کو ہاتھ پیر، آنکھ، دل، دماغ سب دیے جن سے آپ بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ اسٹیفن ہاکنگ ایک ایسی بیماری سے متاثر تھے جس میں ان کے دماغ کے علاوہ سارا حصہ مفلوج ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے بلیک ہول اور وقت کی تاریخ اور بگ بینگ جیسے موضوعات پر تحقیق کی اور دنیا کے سامنے کائنات کے آغاز کا ایک نیا نظریہ پیش کیا۔

'بچوں کی دنیا' میں آپ ارونیما سنہا، ام الخیر، والٹ ڈزنی، رائٹ برادر وغیرہ کی کہانیاں پڑھ چکے ہیں۔ جو مشکل حالات سے گزر کر کامیاب ہوئے اور آج ساری دنیا ان کے نام سے واقف ہے۔ ہم آئندہ بھی اس طرح کی حوصلہ افزا کہانیاں اور مضامین آپ کے لیے پیش کرتے رہیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ 'بچوں کی دنیا' کو آپ سب اسی طرح پیار اور خلوص دیتے رہیں گے۔ اپنے تاثرات سے ہمیں ضرور آگاہ کریں۔

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈاک خانہ

□ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کی جانب سے شائع ہونے والا ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' ماہ فروری 2018 باصرہ نواز ہوا۔ حکومت ہند کے وزارت انسانی وسائل کے زیر اہتمام یہ قومی کونسل جہاں بڑوں کے لیے ادبی ماہنامہ اردو دنیا، سہ ماہی فکر و تحقیق جیسے رسالے شائع کرتی ہے وہیں ہمارے ملک و ملت کے مستقبل مراد نونہالوں کے لیے بھی ایک ماہنامہ بچوں کی دنیا شائع کر کے ملک کے چپے چپے میں پہنچانے کا کام کرتی ہے۔

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' ماہ فروری 2018 کا شمارہ پیش نظر ہے. دیدہ زیب کور پیج، قیمتی کاغذ کا استعمال اور تمام تر صفحات ہمہ رنگی، پھر طرہ امتیاز یہ کہ عنوانات اور مضامین سے ہم آہنگ تصاویر.. یقیناً کونسل کا یہ شمارہ کسی بھاری قیمتی انگریزی جریدے کی غمازی کر رہا ہے. ہمہ رنگی چھپائی سے لیس دیدہ زیب اس ماہنامے کی قیمت صرف دس روپے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دس سیاہ و سفید زیراکس پیپر کے لیے دس روپے خرچ ہو جاتے ہیں لیکن...... ہمہ رنگی 62 صفحات اور اندر موجود معلومات افزا تخلیقات پہ مبنی ایک مکمل جریدے کی قیمت صرف دس روپے...

اس شمارے میں مضامین میں جناب احرار حسین کا مضمون معروف سائنسدان الفریڈ نوبل کے حیات و کارنامے اور نوبل ایوارڈ کے مقاصد سے واقف کراتا ہے تو دوسرا مضمون جدید ٹیکنالوجی میں 5 جی نیٹ ورک سے قارئین کو آگاہ کر رہا ہے۔ یقیناً یہ دونوں مضامین بچوں اور بڑوں دونوں کی معلومات میں اضافہ کرنے والے ہیں۔ جناب شمس الاسلام کا مضمون لیموں کی تتلی، سائنسی معلومات سے پر ہے۔ ساگوان کے بارے میں مضمون اچھا ہے۔ مہاتما گاندھی کے ایک بھگت لاری بیکر اور سماجی و انسانی خدمت گار مدر ٹریسا کا مختصر تعارف مفید ہے۔ نظموں میں جلال الدین خاں راج کی نظم 'اردو' آسان اور سہل زباندانی کی نمائندگی کرتی ہے۔ جناب متین اچلپوری کی نظم منگل یان اور کلیان تھانہ کے رفیق گلاب کی نظم آؤ بچو! کریں ڈرامہ بھی دل پذیر ہیں۔ جناب مرتضی ساحل تسلیمی کا ترانہ اتحاد عالمی بھائی چارے کو فروغ اور امن و آشتی کا پیغام دیتا ہے اور جناب شاہد ساگری کی نظم بچوں کے تئیں پیار و محبت کے ساتھ ان سے ہمدردی کا سبق دیتی ہے۔

بچوں کی دنیا کے اس شمارے میں مختصر تصویری اور قسط وار کہانیوں پر زیادہ توجہ دی گئی ہے جو بچوں کی دلچسپی کو بنائے رکھنے میں معاون ثابت ہو رہی ہیں تو دوسری طرف کہکشاں میں اشعار، بڑوں کی باتیں اور ننھوں کے لیے مختصر سبق آموز کہانیاں، مہذب لطائف اور دماغی ورزش کا سامان مہیا کرایا گیا ہے۔

بچوں کے اس ماہنامے میں ننھے فنکار کے تحت بچوں کی اپنی شخصی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے اور حوصلہ افزائی کے لیے ایک آنگن ہی کھلا چھوڑ دیا ہے اور اردو فیس بک سے بچوں کے نمائندہ تاثرات کو شائع کر کے ان کی ہمت افزائی کی گئی ہے۔ لیکن اس رسالے میں فیس بک اکاؤنٹ کا نام و ایڈریس کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ لہٰذا اس کو آئندہ شماروں میں درج کریں۔ دوسری بات لفظی معمے کے لیے ایک صفحہ مختص کریں تو بچوں کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کا سبب بنے گا۔

محمد مسلم کبیر، لاتور ضلع رپورٹر، مہاراشٹر

امجد اسلام امجد

اسٹیفن ہاکنگ

(پ: 8 جنوری 1942، و: 14 مارچ 2018)

امجد اسلام امجد ہمارے عہد کے نہایت معتبر شاعر، نقاد، ڈرامہ نگار ہیں۔ ان کی تحریریں بیشتر اہم رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ انھوں نے اسٹیفن ہاکنگ کے حوالے سے بہت عمدہ کالم لکھا ہے۔ ہم نے بچوں کی ذہنی سطح کا خیال رکھتے ہوئے اس تحریر کی زبان ذرا آسان کردی ہے تاکہ بچے اسٹیفن ہاکنگ کی شخصیت اور ان کے خیالات کے بارے میں کچھ جان سکیں۔

(ادارہ)

آئن اسٹائن کے بعد جدید سائنس میں اسٹیفن ہاکنگ نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی جس کی وجہ سے اس کے سائنسی انکشافات بالخصوص بلیک ہول کے بارے میں نظریات تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی عجیب وغریب بیماری اور معذوری نے بھی ان کی شہرت میں بہت اضافہ کیا لیکن یہ بھی قابل ذکر ہے کہ کائنات کے رازوں کو کھولنے اور اس کے عقلی جواز کو سمجھنے اور سمجھانے میں ان کا کام بے حد اہم اور تہلکہ خیز ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں سوشل میڈیا میں ایک طبقہ ہر بات کو کھینچ کھانچ کر مذہب کے دائرے میں بند کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ خود رب کریم کے اس پیغام سے ہی انکار کرنے لگتا ہے کہ اس کائنات میں کوئی چیز بے مقصد پیدا نہیں کی گئی اور عقل وفہم کی قوت سے ان کے درمیان رشتوں کو دریافت کرکے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ اب اگر کچھ لوگ اس تلاش کے عمل میں خالق کائنات کو اس طرح سے نہیں مانتے تو اس سے نہ صرف رب کائنات کو کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ انکار سے اس کی پہچان کے نئے نئے راستے بھی کھلتے ہیں اور منزل کی طرف جانے والے تمام رستے بظاہر مختلف نظر آنے کے باوجود بھی حقیقت میں اپنے اندر رشتہ رکھتے ہیں۔ اگر اسٹیفن ہاکنگ یا اسی کی طرح کے بے شمار لوگ بھی شخصی خدا کے تصور سے انکار کریں یا اس کو ہماری طرح نہیں مانتے ہیں تو ہمیں ان کی عاقبت کی فکر کرنے کے بجائے ان کی تحقیق اور ذہانت کی تعریف کرنی چاہیے کہ رب کریم کی حیثیت اور حشر کے روز کا علم صرف اسی کے پاس ہے اور یہ کہ یہ سب تماشا اسی کی مرضی اور ارادے کے مطابق ہورہا ہے۔

بات اسٹیفن ہاکنگ کے جسمانی وجود کی معذوری اور اس کے ذہن کی انتہائی غیر معمولی کارکردگی اور صلاحیت کی ہے جو اپنی جگہ پر قدرت کا ایک انوکھا روپ ہے کہ جو کام لاکھوں جسم اور ذہن مل کر نہیں کرسکتے وہ ایک شخص کی پلک کی حرکت

میں سمٹ آیا ہے۔ میرے مرحوم دوست ارشاد صدیقی کے بیٹے اور برادر عزیز انور مسعود کے داماد حاشر ابن ارشاد نے اسٹیفن ہاکنگ سے کیے گئے کچھ سوالات کے جوابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان میں سے چند ایک کا مطالعہ ہمیں اس عظیم اور بے مثال انسانی دماغ کی حیرت انگیز قوت اور صلاحیت کو جاننے میں مدد کرتا ہے۔

سوال: اگر خدا نہیں ہے تو اس کے وجود کا تصور اتنا مقبول کیسے ہو سکتا ہے؟

جواب: میں نے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ خدا وجود نہیں رکھتا، ہم اس جہان میں کیوں ہیں؟

یہ سوال جب بھی ایک انسانی ذہن میں اٹھتا ہے تو اس کی توجیہ کا نام وہ خدا ہی رکھتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ میرے خیال میں یہ توجیہ طبیعاتی سسٹم پر مشتمل ہے نہ کہ ایک ایسا وجود جس سے ایک ذاتی تعلق استوار کرنا ممکن ہو۔ میرا خدا ایک غیر شخصی خدا ہے۔

سوال: ایسی کون سی سائنسی دریافت یا پیش رفت ہے جسے آپ اپنی زندگی میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں؟

جواب: میں چاہتا ہوں کہ جوہری ادغام سے روزمرہ کی توانائی کی ضروریات پوری ہونے کا عملی راستہ نکلے اس سے ہم توانائی کے ایک ایسے نہ ختم ہونے والے ذریعے سے متعارف ہوں گے جس میں نہ تو آلودگی کا کوئی خطرہ ہے اور نہ ہی گلوبل وارمنگ یا زمینی تپش کا۔

سوال: لوگ آپ سے امید کرتے ہیں کہ آپ زندگی کی تمام گتھیوں کا راز سلجھا سکتے ہیں کیا امیدوں کا یہ بوجھ آپ کو ایک بہت بڑی ذمے داری محسوس نہیں ہوتا؟

جواب: دیکھیے سچ تو یہ ہے کہ میرے پاس زندگی کے ہر مسئلے کا حل نہیں ہے، طبیعات اور ریاضی ہمیں یہ تو بتا سکتے ہیں کہ کائنات کا آغاز کیسے ہوا لیکن وہ انسانی رویوں کی پیش گوئی نہیں کر سکتے۔ انسانی رویے بہت پیچیدہ ہیں۔ میں بھی خود کو اس بارے میں انتہائی حیران و پریشان اور لاعلم محسوس کرتا ہوں جتنا کوئی اور شخص۔

سوال: کیا کبھی کوئی ایسا وقت آئے گا جب انسان طبیعات کے بارے میں سب کچھ جان جائے گا؟

جواب: میں امید کرتا ہوں کہ ایسا وقت نہیں آئے گا ورنہ میں کہاں سے اپنی روزی کماؤں گا۔

اس آخری جواب پر طرح طرح کا ردعمل سامنے آیا، حالانکہ اس کا تعلق صرف اس سینس آف ہیومر سے ہے جو ہم سب کا ایک خوب صورت اجتماعی ورثہ ہے۔ البتہ اسٹیفن ہاکنگ کا یہ کمال ضرور ہے کہ اس نے اس میں اپنی روزی کمانے کے استعارے کو شامل کر کے اس بات کو ایک عجیب اور تخلیقی شکل دے دی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس کی آخرت کا معاملہ اس پر اور رب کائنات پر چھوڑ دیں اور صرف یہ دیکھیں کہ اس نے ہمارے لیے علم اور معلومات کے جن خزانوں کے دروازے کھولے ہیں ان کے اندر کیا ہے شاعر تو صرف یہ کہہ کر خاموش ہو گیا کہ:

اس حرف 'کن' کی ایک امانت ہے میرے پاس
لیکن یہ کائنات مجھے بولنے تو دے!

اسٹیفن ہاکنگ ان منتخب اور عظیم لوگوں میں سے ایک تھا جنھوں نے خدا اور کائنات سے اپنی زبان میں مکالمہ بھی کیا اور ہمیں اس سے آگاہ بھی رکھا۔

■

Amjad Islam Amjad
(Pakistan)

منور حسن کمال

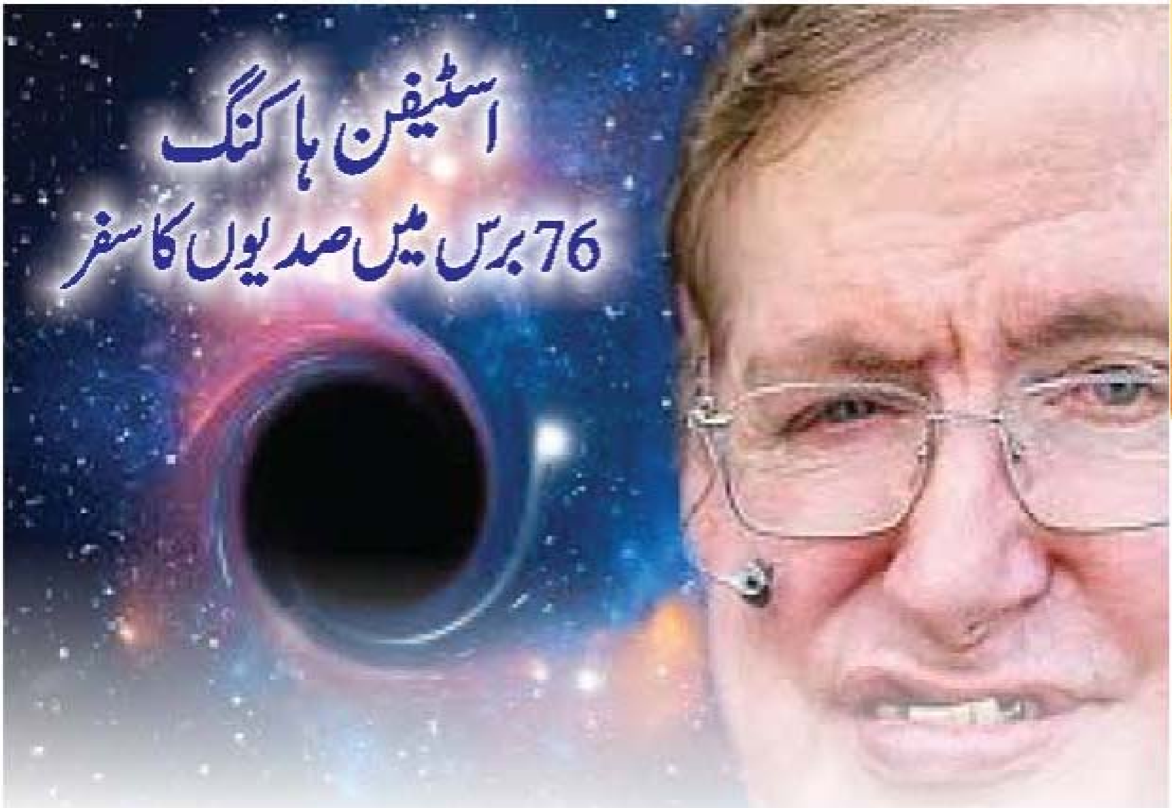

اسٹیفن ہاکنگ (Stephen Hawking) گزشتہ اور موجودہ صدی کے معروف ماہر طبیعیات تھے۔ سائنس کی دنیا نے انھیں آئن اسٹائن کے بعد دنیا کا دوسرا بڑا سائنس داں قرار دیا ہے۔ بلیک ہول (Black Hole) اور جدید سائنس کے میدان میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

ان کی کتاب وقت کی مختصر تاریخ (A. Brief History of Time) سائنسی میدان کی مشہور تصنیف ہے۔ یہ کتاب سادہ اور آسان زبان میں ہے، جس سے بڑے محققین کے ساتھ ایک عام قاری بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ وہ ایک خطرناک بیماری میں مبتلا تھے۔ کیا کوئی تصور کر سکتا ہے کہ کوئی انسان اتنا معذور ہو کہ اس کے جسم کے اعضا نہ صرف مفلوج ہوں، بلکہ وہ ہاتھ، پاؤں ہلانے پر بھی قدرت نہ رکھتا ہو اور اس نے اس ناقابلِ بیان بیماری کو شکست دیتے ہوئے سائنس کے نہایت اہم موضوع پر کتابیں تصنیف کی ہوں۔ بہ ظاہر یہ سب ناممکن نظر آتا ہے، لیکن اسٹیفن ہاکنگ نے یہ سب کر کے دکھایا ہے۔ یہ سب اس لیے ممکن ہو سکا کہ وہ دماغی طور پر صحت مند تھے اور ان کا حوصلہ جوان تھا۔ ظاہری طور پر روشن خیال طالب علم ہونے کے باوجود اس کے استادوں کا خیال تھا کہ وہ اپنی پڑھائی پر بھرپور توجہ نہیں دیتا ہے اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنی پوری لیاقت اور قابلیت کا استعمال نہیں کرتا ہے۔ وہ 1959 سے 1962 تک یونیورسٹی کالج آکسفورڈ میں زیرِ تعلیم رہے پھر 30 ستمبر 1962 سے 28 فروری 1966 تک ٹرنٹی ہال میں تعلیم حاصل کی۔ 1960 کی دہائی میں انھیں بیساکھی کا سہارا لینا پڑا۔ پھر جب وہ وہیل چیئر پر آئے تو لوگوں کا کہنا ہے کہ انھیں

کیمبرج کی سڑکوں پر تیز بیٹری سے چلنے والی اپنی وہیل چیئر سڑکوں پر تیزی سے چلاتے ہوئے دیکھا گیا بلکہ ان کے 60ویں یوم پیدائش پر اسی وجہ سے ان کی ٹانگ بھی ٹوٹ گئی تھی۔

اسٹیفن ہاکنگ کے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ وہ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ ہنس مکھ شخص بھی تھے۔ انھوں نے ان کے ایک انٹرویو کے بارے میں لکھا ہے کہ آکسفور یونیورسٹی میں انٹرویو کے دوران ان سے پوچھا گیا کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ اگر آپ نے مجھے فرسٹ ڈویژن دی تو میں پی ایچ ڈی کرنے کیمبرج جاؤں گا، نہیں تو اسی یونیورسٹی میں پڑا رہوں گا۔ آکسفورڈ کے ذمہ داروں نے انھیں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور اسٹیفن پی ایچ ڈی کرنے کیمبرج چلے گئے۔ اس دوران انھیں اپنی سنگین بیماری کا علم ہوا۔ اس خبر نے جیسے ان پر بجلی گرادی کہ وہ موٹر نیوران جیسی ناقابلِ علاج بیماری کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ مرض ان اعصاب کو تباہ کردیتا ہے جو جسم کو حرکت دینے والے افعال کو قابو میں رکھتے ہیں۔ انھیں لگا کہ وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہیں گے۔ اس لیے تعلیم جاری رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن جب انھوں نے بیماری کا یہ شدید جھٹکا برداشت کرلیا تو پھر انھوں نے اپنی پوری توجہ ایک نکتہ پر مرکوز کردی۔

اسٹیفن ہاکنگ کا اصل موضوع Physics تھا جس کو اردو میں طبعیات کہتے ہیں۔ فزکس میں ان کا خصوصی میلان Theoretical Physics تھا جس کو اردو میں نظریاتی طبعیات کہتے ہیں۔

1970 کی دہائی کے آغاز میں اسٹیفن ہاکنگ کے منفرد اور ممتاز مقالے شائع ہونے لگے تھے، جن میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آئن اسٹائن کے نظریے میں وحدانیت جہاں ٹھوس لامتناہی قوت بن جاتی ہے اضافیت کا ایک ناگزیر حصہ ہے اور اس کو آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ نظریۂ اضافیت کے مطابق روشنی کی شعاعیں سورج کے پاس سے گزرتے ہوئے ہلکا سا اپنا رخ تبدیل کرتی ہیں۔ روشنی کے مڑنے کی تصدیق سورج گہن کے دوران برطانوی سائنس والوں نے 1919 میں دریافت کی تھی۔ یہاں سے البرٹ آئن اسٹائن شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے تھے۔

اسٹیفن ہاکنگ نے 1974 میں اس بات کو ثابت کیا کہ بلیک ہول مکمل طور پر بلیک نہیں، بلکہ وہ وقفے وقفے سے شعاعوں کا اخراج کررہے ہیں۔ اس کو اب ہاکنگ کی شعاع کہا جاتا ہے۔ اسٹیفن ہاکنگ خدا کے وجود کے قائل نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب 'دی گرانڈ ڈیزائن' میں اس کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے سوال کیا ہے کہ دنیا بنانے سے پہلے خدا کررہا تھا؟ ان کے چاہنے والے اور کئی سینئر افراد نے اس کو عجیب حسن اتفاق قرار دیا ہے کہ 14 مارچ کو جب دنیا البرٹ آئن اسٹائن کا یوم پیدائش منا رہی تھی تو اسٹیفن دنیا چھوڑ گئے۔ انھوں نے 76 برس میں صدیوں کا سفر طے کیا۔

علم طبعیات کے بارے میں مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ فطرت کو سمجھنے اور کائنات میں ہونے والی تبدیلیوں سے پوری طرح واقف ہونے کا علم ہے۔ جدید سائنس میں اس کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے۔ اس علم سے متعلق یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اس علم کی ابتدا کب ہوئی۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس علم کی ابتدا مشہور یونانی فلسفیوں ارسطو اور افلاطون سے پہلے کے عہد میں ہوچکی تھی۔ پھر ارسطو اور افلاطون نے اس علم کو آگے بڑھایا۔ اس طرح یہ موضوع ماقبل مسیح بھی اپنی

ابتدائی شکل میں موجود تھا۔ ظہور اسلام کے بعد علم طبعیات کو عروج حاصل ہوا اور فارابی، ابن ہیثم، کندی، طوسی اور عمر خیام نے اس علم کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا لیکن آج مسلمانوں کا یہ ورثہ کہیں گم ہو گیا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کے پاس علم سے وابستہ ہونے کی مضبوط بنیاد موجود ہے۔

بلیک ہول اور بگ بینگ تھیوری میں اسٹیفن ہاکنگ کی خدمات کے سبب پوری دنیا میں ان کا وقار بہت بلند ہے لیکن وہ خود کو آخر عمر تک محض ایک سائنس داں ہی قرار دیتے رہے۔ بعض مشکل حالات کے سبب انھوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی اور چار برس بعد اس اہم شخص کی بیوی سے شادی کی تھی، جس نے ان کے لیے آواز کو پیدا کرنے والا آلہ تیار کیا تھا۔ آنکھوں اور پلکوں کی جنبش سے جو کچھ وہ چاہتے تھے، کمپیوٹر پر لکھ لیتے تھے۔ وہ اپنی وہیل چیئر پر نصب کمپیوٹر سے پوری دنیا سے جڑے رہتے تھے۔ عمومی اضافیت، نظری طبعیات اور علم الکائنات پر انھیں بھرپور دسترس حاصل تھی۔ 'وقت کی مختصر تاریخ'، 'کائنات کا مکمل ترین نظریہ' ان کے قابل ذکر نمایاں کام ہیں۔ انھیں 1976 میں ہگیس میڈل، 1979 میں تمغہ البرٹ آئن اسٹائن، 1981 میں فرینکلن میڈل، 1988 میں وولف انعام برائے طبعیات، 1999 میں تمغہ البرٹ اور 2006 میں کاپلی میڈل جیسے اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔

■

Dr. Munawwar Hasan Kamal
Baitur-Razia, G-5/A, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025

جوابات

عظیم اقبال

اسٹیفن ہاکنگ سے ملیں

Stephen William Hawking
(1942-2018)

اسٹیفن ہاکنگ کیمبرج یونیورسٹی میں طبیعات کے پروفیسر رہے۔ ان کی کتابیں بڑی تعداد میں فروخت ہوئیں۔ لہٰذا وہ Best Selling Authos کے طور پر مقبول ہوئے۔ آپ نے وہیل چیئر سے ساری کائنات کی سیر کرلی۔ اصول کشش کے مزاج پر غور کیا، کائنات کی ابتدا کیونکر ہوئی اس کے متعلق فکر کی۔ مزید انسانی تجسس (Curiosity) نیز قوتِ ارادی (Determination) کی علامت قرار دیے گئے۔

اسی موقعے پر سٹی یونیورسٹی، نیویارک میں نظریاتی طبیعات کے پروفیسر میشوکاکو (Michio Kaku) نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ البرٹ آئن اسٹائن کے بعد کسی دیگر سائنس داں نے عوامی سوچ کو اتنا متاثر نہیں کیا۔ وہ دنیا بھر میں کروڑوں لوگوں میں ہردلعزیز رہے۔

ہم یاد دلا دیں کہ البرٹ آئن اسٹائن 14 مارچ 1899 کو جرمنی میں پیدا ہوئے تھے۔ اسکول کے دنوں میں وہ ایک معمولی طالب علم تھے۔ بعد میں زیورخ (Zurich) کے پولی ٹیکنک میں ان کا داخلہ ہوا۔ 1901 میں انھوں نے ڈپلوما کیا۔ پھر سوئس پیٹنٹ (Patent) کے دفتر میں انھیں کلرک کی نوکری مل گئی۔ 1905 میں انھوں نے نظریۂ اضافت سے متعلق اپنے جنرل تھیوری کے اجزا (Components of His General Theory of Relativity) کی اشاعتیں شروع کیں۔ اس میں انھوں نے دکھایا کہ جہاں مشاہد (Observer) مائل بہ سفر (Travelling) ہے وہاں وقت، رفتار کے تئیں اضافی ہے۔ جنرل تھیوری کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر مادہ یا جوہر (Matter) کو توانائی (Energy) میں تبدیل کردیں تو خارج ہونے والی توانائی $E=mc^2$ کے مساوی ہوگی۔ یہاں C روشنی کی رفتار کی نمائندگی کرتی ہے۔ E توانائی ہے اور m ڈھیر یا انبار (Mass) ہے۔

جوہری توانائی (Nuclear Energy) کے متعلق ان کی دریافت نے ستاروں کے مزاج کی تشریح بھی کی۔ انھیں Photo Electric Effect کے مطالعے پر 1921 میں طبیعات کا نوبل انعام تفویض ہوا۔ 1933 میں وہ امریکہ ہجرت کرگئے کیونکہ وہ نازی حکومت کا دور تھا اور وہ صیہونی

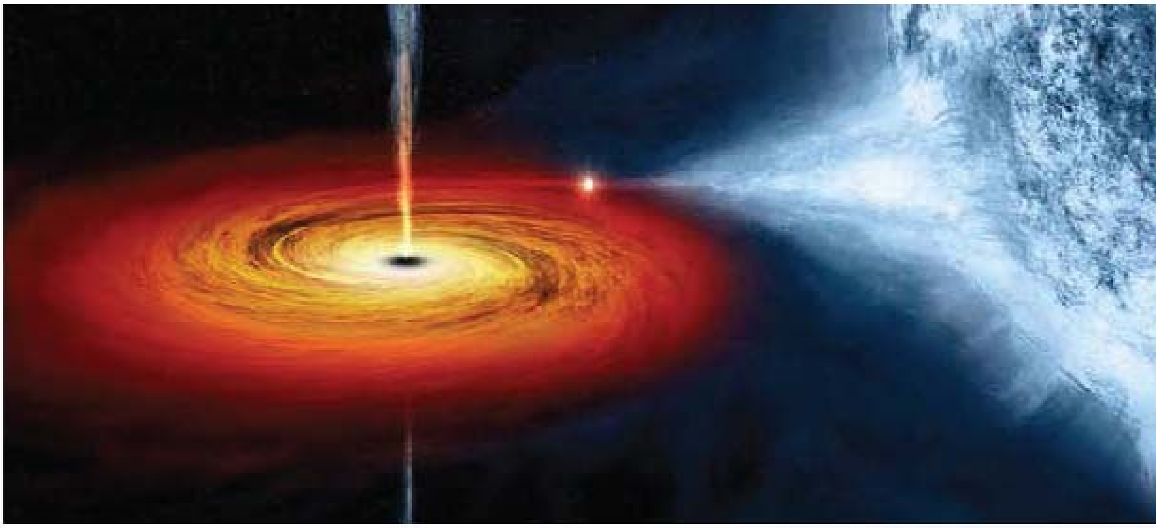

تھے۔ 1955 میں ان کا انتقال ہوا۔

اتفاق کی بات ہے کہ آئن اسٹائن 14 مارچ 1879 کو پیدا ہوئے۔ یہ وہی تاریخ ہے جب ہاکنگ کی وفات 14 مارچ 2018 کو ہوئی۔ ہاکنگ 8 جنوری 1942 کو پیدا ہوئے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ اسی دن ٹھیک 300 سال پہلے ایک دیگر سائنس داں، گلیلیو گلیلی (Galileo Gali Lei) کی وفات ہوئی۔ یہاں بھی یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ گلیلیو گلیلی (1564-1642) پہلے ہیئت داں (Astronomer) تھے، جنھوں نے دوربین کا باضابطہ اور مستقل استعمال کیا اور فلکیات کی دنیا میں ایک نئی تاریخ رقم کی۔ ان کی پیدائش اٹلی میں ہوئی تھی۔ 24 سال کی عمر میں وہ پیسا (Pisa) میں ریاضی کے پروفیسر بنے۔ انھوں نے اس نظریے کی وضاحت کی اور ثابت کیا کہ مختلف اوزان کی اشیا مساوی رفتار سے گرتی ہیں۔ گلیلیو نے سیارہ جوپیٹر کے 4 بڑے چاند کی دریافت کی۔ انھوں نے چاند کی سطح کا مطالعہ کیا، مزید سورج کی سطح پر اس کے دھبوں (Spots) کا پتہ لگایا۔ آپ نے نکولس کوپرنیکس (Nicholas Copernicus) کے نظریے کی تائید کی کہ نظامِ شمسی (Solar System) کا مرکز زمین نہیں، بلکہ سورج ہے۔ اپنے خیالات کے لیے انھیں چرچ کی ناراضگی اور برہمی کا سامنا کرنا پڑا۔

ہاکنگ کی کتاب A Brief History of Time: from the Big Bang to Black Holes. 1988 میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کی ایک کروڑ سے زائد کاپیاں فروخت ہوئیں۔ Errol Morris نے اس سے تحریک پاکر ایک دستاویزی فلم بنائی۔ یہ ان کی زندگی پر مبنی تھی۔ فلم کا نام تھا The Theory of Every Thing اسے کئی اکادمی ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔ اداکار Eddie Red Mayne نے ہاکنگ کا کردار نبھایا، جنھیں بہترین اداکار کا آسکر انعام دیا گیا۔

Zen Koan کے بقول سائنسی طور سے ہاکنگ کو ان کی اس انوکھی تفتیش کے لیے یاد رکھا جائے گا کہ "بلیک ہول کب بلیک نہیں ہوتا؟— جب اس میں دھماکہ ہوتا ہے۔"

ان کے کریئر کی جانکاری سے بھی ہم پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ 1963 میں وہ گریجویشن کررہے تھے انھی دنوں انھیں علم ہوا کہ انھیں Amyo Trophic Lateral

Sclerosis کا عارضہ ہے۔ اسے Neuro Muscular عارضہ مانا گیا۔ یہ دھیرے دھیرے انسانی وجود کو ختم کرتا ہے۔ اسے Lou Gehrigs بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی زندگی محض چند سال بتائی گئی۔ اس عارضے نے ان کے سارے جسم کو بے حرکت بنا دیا۔ وہ اپنی انگلیاں تک نہیں گھما سکتے تھے۔ ان کی آنکھوں کی پتلیاں بھی خود سے حرکت نہیں کر سکتی تھیں۔ البتہ ان کی ذہنی قوت برقرار رہی۔

اپنی نسل کے وہ سربراہ تھے جنھوں نے کشش (Gravity) کی تحقیق کی اور بلیک ہولس (Black Holes) کی خاصیت بتائی۔ ان کے بقول یہ کشش کے وہ گڑھے (Pits) ہیں۔ جن کا پیندا نہیں ہوتا۔

(Bottomless Gravitational Pits) یہ اتنے گہرے (Deep) ہوتے ہیں کہ روشنی تک ان سے مفرور نہیں ہو سکتی۔

(So deep that even light cannot escape)

ہاکنگ 55 برسوں تک اپنے عارضے سے برسرپیکار رہے۔ وہ اس سے خوف زدہ نہیں ہوئے بلکہ ہمت و حوصلہ سے اس کا سامنا کرتے رہے۔ ان میں غیر معمولی حوصلہ تھا۔ ان میں غیر معمولی ذہانت بھی تھی۔ وہ کرشمۂ قدرت کی بہترین مثال تھے۔ اپنے ایک رخسار کو جنبش دے کر وہ کمپیوٹر کو احکامات دیتے رہے۔ کائنات کے اسرار میں کھوئے رہے اور نئے نئے انکشافات کرتے رہے۔

1966 میں لکھے گئے ان کے تحقیقی مقالے کو اکتوبر 2017 میں انٹرنیٹ پر عام کرنے کے بعد 20 لاکھ لوگوں نے پڑھا اور 5 لاکھ لوگوں نے ڈاؤن لوڈ کیا جس کی وجہ سے انٹرنیٹ ویب سائٹ بھی کچھ وقت کے لیے مفلوج ہو گئی۔

ہاکنگ آٹھویں جماعت تک ٹھیک سے پڑھ بھی نہ پائے تھے۔ وہ 'بی' گریڈ میں پاس ہوئے۔ اس لیے اساتذہ کی نگاہ میں کم تر حیثیت رکھتے تھے۔ وہ اوسط درجہ کے طالب علم رہے۔ پھر مفلوج ہو گئے۔ اس کے باوجود انھوں نے آکسفورڈ میں داخلے کا امتحان پاس کیا۔ جسمانی معذوری ان کی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنی۔

ایک انٹرویو میں ہاکنگ نے کہا تھا:

"میں نے ہمیشہ اپنی حدوں سے پار زندگی کو پوری طرح جینے کی کوشش کی ہے۔"

آپ نے مزید کہا تھا:

"اوروں کی نظر میں میری زندگی معمول کی نہیں ہے، لیکن میں ایسا نہیں مانتا۔ میں صلاحیت، جوش، ہمت، حوصلہ اور صبر میں کسی سے کم نہیں ہوں، اور نہ ہی اپنی زندگی سے مایوس۔"

ہاکنگ اپنا تجربہ دوسروں سے شیئر کرنا چاہتے تھے:

"... زندگی کی وسعت کو سمجھنا ہے تو آپ کو مثبت اور عملی سوچ رکھنی ہوگی۔"

پس تحریر:

اسٹیفن ہاکنگ کی وفات دنیائے سائنس کا بھاری خسارہ ہے! تاہم ان کے خیالات و نظریات سے نہ صرف ہم بلکہ ہماری آنے والی نسلیں تادیر مستفید ہوتی رہیں گی۔

■

Azim Iqbal
Adabistan, Ganj No 1
Bettiah - 845438 (Bihar)

اسٹیفن ہاکنگ

اسٹیفن ہاکنگ کی تاریخ پیدائش 8 جنوری 1942 ہے، جس سے ٹھیک 300 برس پہلے، 8 جنوری 1642 کے روز، مشہور سائنس داں گیلیلیو گیلیلی کا انتقال ہوا تھا۔ اسی طرح اکیسویں صدی کا عظیم ترین سائنس داں، البرٹ آئن اسٹائن، آج سے ٹھیک 139 سال پہلے، 14 مارچ 1879 کے روز پیدا ہوا تھا یعنی اسٹیفن ہاکنگ کی پیدائش سے لے کر وفات تک کی تاریخوں میں دلچسپ اتفاقات ملتے ہیں۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کی بدولت اسٹیفن ہاکنگ کی شخصیت اور خدمات پر (غلط یا صحیح) معلومات آپ کو جگہ جگہ مل جائیں گی۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہوگا کہ وہ 21 یا 22 سال کی عمر میں 'اے ایل ایس' نامی ایک اعصابی بیماری (موٹر نیورون ڈزیز) میں مبتلا ہو گئے تھے اور ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ چند مہینے ہی زندہ رہ پائیں گے۔

بیماری نے انھیں ساری زندگی کے لیے وہیل چیئر تک محدود کر دیا تھا لیکن انھوں نے 55 سال تک نہ صرف بہادری سے اس بیماری کا مقابلہ کیا بلکہ اپنی پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے بعد، دنیا کے مشہور سائنس دانوں میں نمایاں مقام بھی حاصل کیا۔

آپ غالباً یہ بھی پڑھ چکے ہوں گے کہ اسٹیفن ہاکنگ کا تحقیقی کام 'بلیک ہولز' اور 'کونیات' (کوسمولوجی) کے میدان میں تھا، لیکن کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ اس کام کی نوعیت کیا تھی۔

اسٹیفن ہاکنگ نے نہ تو بلیک ہولز دریافت کیے تھے اور نہ ان کے موجود ہونے کی پیش گوئی ہی کی تھی۔ (بلیک ہولز کی پیش گوئی 1930 کے عشرے میں نوجوان ہندوستانی سائنس داں، سبرامانیم چندر شیکھر نے کی تھی اسے اس زمانے کے معتبر ترین ماہرِ طبیعیات، سر آرتھر ایڈنگٹن نے مسترد کر دیا تھا۔

البتہ، اسٹیفن ہاکنگ کی تحقیق کا زیادہ تعلق اس بات سے رہا کہ بلیک ہولز سے کسی قسم کی شعاعیں خارج ہوتی بھی ہیں یا نہیں۔ 1970 کے عشرے میں کوانٹم میکانیات اور آئن اسٹائن کے عمومی نظریہ اضافیت کو ایک ساتھ استعمال کرتے ہوئے (جو آج بھی بہت مشکل کام ہے)، اسٹیفن ہاکنگ نے بتایا کہ بلیک ہولز کے 'قطبین' سے مسلسل کچھ نہ کچھ اشعاع (ریڈی ایشن) کا اخراج ہوتا رہتا ہے؛ اور اسی کے نتیجے میں، آخرکار، بلیک ہولز بھی دھماکے سے پھٹ جاتے ہیں۔ ان اشعاع کو آج 'ہاکنگز ریڈی ایشنز' کہا جاتا ہے۔ وسیع تر سائنسی شعبے 'نظری

طبیعیات' (تھیوریٹیکل فزکس) کے تحت آنے والے اس اہم کام میں ایک اور مشہور برطانوی سائنس داں راجر پنروز بھی اسٹیفن ہاکنگ کے ساتھی رہے تھے۔

سائنسی حلقوں کے لیے یہ خیال بہت حیران کن تھا کیونکہ اس سے پہلے تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ بلیک ہولز سے 'کچھ بھی' خارج نہیں ہوتا اور جو چیز بھی کسی بلیک ہول میں گرتی ہے، وہ ہمیشہ کے لیے وہیں پر قید ہو کر رہ جاتی ہے؛ چاہے وہ روشنی ہی کیوں نہ ہو۔

بلیک ہول کی حد یعنی 'واقعاتی افق' (ایونٹ ہورائزن) وہ مقام ہے جسے عبور کرتے ہی سائنس (طبیعیات) کے تمام سسٹم جواب دے جاتے ہیں۔ اسی لیے سائنسی بنیادوں پر ہم ہرگز یہ نہیں بتا سکتے کہ ایک بلیک ہول کے 'اندر' کیا ہے؟ اس کے باوجود، بلیک ہولز سے ممکنہ طور پر ریڈی ایشن اخراج کی پیش گوئی بجا طور پر اسٹیفن ہاکنگ کے اہم کارناموں میں سے ایک ہے۔

اسٹیفن ہاکنگ کو شرطیں لگانے کا بھی بہت شوق تھا، اور بالعموم وہ کسی ایسے سائنسی نکتے یا پیش گوئی کے مخالف شرط لگاتے جس کے درست ہونے پر انھیں پورا یقین ہوتا۔ مثلاً انھوں نے 1975 میں امریکی سائنس داں کپ تھورن سے شرط لگائی تھی کہ 'سائنس ایکس ون' نامی ایک ستارے میں (جس سے طاقتور ایکس ریز خارج ہوتی دیکھی گئی ہیں)، کوئی بلیک ہول پوشیدہ نہیں، حالانکہ انھیں مذکورہ مقام پر بلیک ہول کے پوشیدہ ہونے کا پورا یقین تھا۔ 1990 میں ہاکنگ یہ شرط ہار گئے لیکن ان کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی، یعنی وہ ہار کر بھی جیت گئے۔

اسی طرح 1997 میں اسٹیفن ہاکنگ نے کپ تھورن اور جون پریسکل سے شرط لگائی کہ بلیک ہولز سے خارج ہونے والی اشعاع (ہاکنگز ریڈی ایشنز) میں کوئی 'اطلاعات' نہیں ہوتیں۔ یعنی ہاکنگز ریڈی ایشنز کا تجزیہ کر کے ہم کسی بھی صورت میں یہ نہیں بتا سکتے کہ کسی بلیک ہول میں موجود (یا اس میں گر جانے والی) چیزوں کی ماہیت کیسی تھی۔ 2004 میں ہاکنگ نے اس شرط میں بھی اپنی شکست مان لی کیونکہ وہ (اپنی تحقیق کی روشنی میں) یقین رکھتے تھے کہ بلیک ہولز سے خارج ہونے والی اشعاع کی مدد سے ہم یہ پتا کر سکتے ہیں کہ اس میں کیا موجود تھا اور کیا کچھ مزید کر چکا جسمانی معذوری لیکن جواں ہمتی کے باعث اسٹیفن ہاکنگ کو پہلے ہی شہرت حاصل تھی اور وہ کئی بین الاقوامی اعزازات اپنے نام کر چکے تھے، لیکن ہاکنگ کی شہرت زیادہ تر سائنسی حلقوں تک ہی محدود تھی۔ پھر، غالباً 1985 یا 1986 میں، ایک برطانوی ناشر نے ہاکنگ سے رابطہ کر کے انھیں قائل کیا کہ طبیعیات (بالخصوص کونیات) میں جن اہم موضوعات پر تحقیق ہو رہی ہے، انھیں عام فہم اور دلچسپ انداز میں پیش کیا جائے۔ اس طرح اسٹیفن ہاکنگ نے وہ کام شروع کیا جس نے انھیں لازوال شہرت عطا کی۔

اور یوں 1988 میں 'اے بریف ہسٹری آف ٹائم' کے عنوان سے اسٹیفن ہاکنگ کی وہ پہلی سائنسی کتاب شائع ہوئی جو سائنس کا شوق رکھنے والے عام قارئین کے لیے تھی اور جس نے شہرت و مقبولیت کی وہ منزل حاصل کی جو شاید اس سے پہلے کسی اور سائنسی کتاب کے حصے میں نہیں آئی تھی۔ اعداد و شمار کے مطابق، 2008 تک 'اے بریف ہسٹری آف ٹائم' دنیا بھر میں ایک کروڑ سے زیادہ کی تعداد میں فروخت ہو چکی تھی، جو ایک غیر معمولی ریکارڈ ہے۔ (تراجم کی تعداد اس کے علاوہ ہے)

اس کے بعد اسٹیفن ہاکنگ کی زندگی میں ایک نیا دور شروع ہوا جس کا تعلق سائنس کو عام فہم، آسان اور دلچسپ بنانے سے تھا۔ سائنس کا شوق رکھنے والے قارئین انتظار کرنے لگے کہ اسٹیفن ہاکنگ کی کوئی نئی کتاب کب شائع ہوگی اور وہ اسے پڑھیں گے۔

1993 میں ہاکنگ کی دوسری کتاب 'دی بگ بینگ اینڈ بلیک ہولز' شائع ہوئی جو ماہرین کے لیے تھی جبکہ عام قارئین کے لیے ہاکنگ کی ایک اور کتاب 'بلیک ہولز اینڈ بے بی یونیورسز' شائع ہوئی، لیکن وہ بریف ہسٹری آف ٹائم جیسی کامیابی حاصل نہ کرسکی۔ آٹھ سالہ وقفہ کے بعد 2001 میں اسٹیفن ہاکنگ کی ایک اور تصنیف 'دی یونیورس ان اے نٹ شیل' شائع ہوئی جسے قارئین اور ناقدین سب نے بہت پسند کیا۔ اسے بریف ہسٹری آف ٹائم کا دوسرا حصہ بھی قرار دیا گیا۔

2002 میں ہاکنگ نے سائنسی تاریخ کا احاطہ کرتی ہوئی تحریروں کا مجموعہ 'آن دی شولڈرز آف جائنٹس' مرتب کیا جس میں اپنی جانب سے تبصروں کا اضافہ بھی کیا۔ البتہ اس کتاب کو کچھ خاص پذیرائی نہ مل سکی۔ اسی سال اسٹیفن ہاکنگ کی 'تھیوری آف ایوری تھنگ' شائع ہوئی جو عملاً بریف ہسٹری آف ٹائم ہی تھی؛ لیکن پھر بھی نئے پڑھنے والوں نے اسے بہت پسند کیا۔

اسی کے ساتھ اسٹیفن ہاکنگ کی سمجھ میں یہ بات بخوبی آگئی کہ انھیں اپنی ہر کتاب کی کامیابی کے لیے بریف ہسٹری آف ٹائم کی لازوال شہرت سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔ شاید اسی سوچ کے تحت انھوں نے 2005 میں 'اے بریف ہسٹری آف ٹائم' شائع کروائی جس میں ان کے شریک مصنف لیونارڈ ملوڈینو تھے۔ اپنے نام کی وجہ سے یہ کتاب بھی مقبول ہوئی۔

اے بریف ہسٹری آف ٹائم کے پیش لفظ میں اسٹیفن ہاکنگ نے لکھا تھا کہ اگر آپ اپنی کتاب میں صرف ایک ریاضیاتی مساوات بھی شامل کرتے ہیں تو اس کی متوقع تعداد فروخت آدھی کر دیتے ہیں جبکہ لفظ 'خدا' کا استعمال، اس کتاب کی تعداد فروخت دوگنی کرنے کا باعث بنتا ہے لیکن دوسری سچائی یہ ہے کہ 2005 میں اسٹیفن ہاکنگ کی ایک کتاب کا عنوان 'گاڈ کری ایٹڈ دی انٹیجرز' (خدا نے صحیح اعداد تخلیق کیے) تھا۔ بنیادی طور پر یہ ہاکنگ کا ذاتی کام نہ تھا بلکہ اس میں ریاضیاتی تاریخ کی 31 اہم ترین تحریریں جمع کی گئی ہیں۔ ہاکنگ نے اسی طرز کے عنوان والی ایک کتاب 'دی گرینڈ ڈیزائن' شائع کروائی جو اپنے عنوان کے اعتبار سے گمراہ کن تھی کیونکہ اس میں کائنات کی تخلیق اور ارتقا سے متعلق مختلف تصورات پر بات کی گئی تھی۔

نئی نسل کو دلچسپ اور افسانوی انداز میں سائنس کی جانکاری دینے کے لیے اسٹیفن ہاکنگ نے ایک اور منفرد کام کیا۔ انھوں نے لگ بھگ 2007 میں ایک کردار 'جارج' تخلیق کیا۔ یہ ایک ایسا بچہ تھا جو کائنات کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا ہے اور خلائی سفر پر روانہ ہوجاتا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب 'جارجز سیکرٹ کی ٹو دی یونیورس' 2008 میں شائع ہوئی جبکہ 2016 تک اس سلسلے کی 5 کتابیں شائع ہوچکی تھیں۔ یہ بات کسی سانحے سے کم نہیں کہ ہاکنگ مرگیا، ایک بڑا سائنس داں اس دنیا سے چلا گیا، سائنس کو مقبول عام بنانے والی ایک اہم ہستی اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔

■

بحوالہ : چنار پوائنٹ ڈاٹ کام

ترجمہ و تلخیص: سملرا

اسٹیفن ہاکنگ کے ساتھ وقت میں سفر

اسٹیفن ہاکنگ ایک مشہور سائنس داں تھے۔ وہ آئن اسٹائن کے بعد دنیا کے ذہین ترین شخص مانے جاتے ہیں۔ ڈسکوری چینل پر وقت کے سفر یعنی ٹائم ٹریول کے بارے میں ان کا ایک پروگرام پیش کیا گیا تھا جس میں ہاکنگ نے ماضی یا مستقبل میں سفر کرنے کی انسانی صلاحیت کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس پروگرام کی تفصیل ہاکنگ کی زبانی 'بچوں کی دنیا' میں پیش کی جارہی ہے:

ہیلو! میرا نام اسٹیفن ہاکنگ ہے، ماہر طبیعات، فلکیات اور ایک خواب دیکھنے والا۔ اپنی بیماری کی وجہ سے میں حرکت کرنے سے قاصر ہوں اور بولنے کے لیے مجھے کمپیوٹر کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے، لیکن میں اپنی سوچوں میں آزاد ہوں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا وقت میں سفر (ٹائم ٹریول) ممکن ہے؟ کیا ہم ماضی میں جانے کے لیے کوئی دریچہ کھول سکتے ہیں؟ یا مستقبل میں جانے کے لیے کوئی طریقہ ڈھونڈ سکتے ہیں؟

ایک زمانے میں وقت کے سفر کو محض ایک خیال سمجھا جاتا تھا۔ میں اس بارے میں بات کرنے سے ڈرتا تھا کہ کہیں مجھے کھسکا ہوا نہ سمجھ لیا جائے لیکن اب میں اتنا جان چکا ہوں کہ اگر میرے پاس ٹائم مشین ہوتی تو میں مارلن منرو سے ملنے جاتا یا پھر گلیلیو سے یا پھر میں کائنات کے آخر کی طرف سفر کرتا تاکہ جان سکوں کہ اس کائنات کا انجام کیا ہوگا۔

لیکن وقت میں یہ سفر کیسے ممکن ہوگا؟

اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں وقت کو ماہر طبیعات کی طرح دیکھنا ہوگا یعنی چوتھی سمت (فورتھ ڈائمنشن) کے طور پر۔ یہ سمجھنا مشکل نہیں۔ اسکول جانے والے بچے بھی اس بات سے واقف ہیں کہ تمام مادی اجسام کی تین سمتیں ہوتی ہیں یعنی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی۔

لیکن ان تین سمتوں کے علاوہ ایک چوتھی سمت بھی ہوتی ہے جس کو 'وقت' کہتے ہیں۔ ایک انسانی زندگی اسی ماضی میں کئی ہزار سال سے موجود ہے اور نظام شمسی مستقبل میں کئی ارب سال تک باقی رہے گا یعنی ہر چیز کی لمبائی، چوڑائی اور

اونچائی کے علاوہ وقت یعنی چوتھی سمتیں بھی لمبائی ہوتی ہے اور وقت میں سفر کا مطلب ہے کہ اس چوتھی سمت میں سفر۔

سمتوں کے تصور کو سمجھنے کے لیے روزمرہ کے سفر کی ایک مثال دیتے ہیں۔ ایک کار اگر ایک ہی سمت میں چلی جارہی ہو تو اس کا سفر یک سمتی ہے یعنی لمبائی میں، اگر وہ دائیں یا بائیں طرف مڑ جاتی ہے تو اس کے سفر میں دوسری سمت بھی شامل ہوجاتی ہے، یعنی لمبائی کے ساتھ چوڑائی بھی۔ کسی پہاڑی راستے پر اوپر یا نیچے سفر کرنے سے اس سفر میں تیسری سمت یعنی اونچائی بھی شامل ہوجائے گی لیکن سوال یہ ہے کہ چوتھی سمت یعنی وقت میں سفر کرنے کا راستہ کیسے تلاش کیا جائے۔

اس سوال کے جواب سے پہلے آیئے سائنس فکشن فلموں میں دکھائی جانے والی صورت حال پہ غور کرتے ہیں۔ ان فلموں میں عموماً ایک بڑی مشین دکھائی جاتی ہے جو چوتھی سمت یعنی وقت میں راستہ یا سرنگ بناتی ہے۔ فلم کا ہیرو وقت کا مسافر، ایک بہادر شخص ہوتا ہے جو انجانے نتائج کے لیے تیار ہوتا ہے۔ وہ اس مشین کے ذریعے سرنگ میں داخل ہوتا ہے اور وقت میں نہ جانے کہاں جانکلتا ہے۔ اکثر فلموں کی بنیاد اسی تصور پر ہے لیکن حقیقت اس سے بہت مختلف ہوسکتی ہے۔

طبیعات داں بھی اس طرح کی سرنگوں کے بارے میں غور کرتے ہیں لیکن ہم اس بارے میں ایک دوسرے زاویے سے دیکھتے ہیں۔ ہم یہ غور کرتے ہیں کہ ماضی یا مستقبل میں لے جانے والی سرنگوں کا وجود طبیعات کے نظام کے مطابق ممکن ہے یا نہیں۔ شاید ایسا ممکن ہے۔ ان سرنگوں کو ہم نے وورم ہولز کا نام دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وورم ہولز ہمارے اردگرد ہر طرف موجود ہیں لیکن یہ اتنے چھوٹے ہیں کہ دیکھے نہیں جاسکتے۔ وورم ہولز کا تصور مشکل ہے لیکن اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر آج کسی بھی چیز کو غور سے دیکھیں تو اس میں سوراخ نظر آئیں گے اور سطح غیر ہموار محسوس ہوگی۔ یہ طبیعات کا بنیادی قانون ہے کہ کوئی بھی چیز مکمل طور پر ہموار یا ٹھوس نہیں ہوتی ہے۔ یہی قانون وقت پہ بھی لاگو ہوتا ہے۔ سطح کی غیر ہمواری اور خالی جگہوں کا پہلی تین سمتوں (لمبائی، چوڑائی اور اونچائی) میں اندازہ کرنا آسان ہے لیکن یقین کریں کہ یہ قانون چوتھی سمت یعنی وقت کے لیے بھی درست ہے۔ وقت میں بھی چھوٹی چھوٹی غیر ہمواریاں، جھریاں، اور خالی جگہیں ہیں۔ یہ سوراخ بہت چھوٹے ہوتے ہیں، ایٹم سے بھی چھوٹے۔ ان کی تلاش میں ہم ایسی جگہ پہنچ جاتے ہیں جس کو کوانٹم دھواں (فوگ) کہتے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں وورم ہولز موجود ہیں۔ چھوٹی چھوٹی سرنگیں جو وقت اور خلا میں سفر کو ممکن بناتی ہیں۔ اس کوانٹم دنیا میں وورم ہولز مسلسل بنتے اور ختم ہوتے رہتے ہیں اور یہی اصل میں دو مختلف جگہوں اور دو مختلف اوقات کو آپس میں ملاتے ہیں۔

بدقسمتی سے حقیقی زندگی کی یہ وورم ہولز ایک سینٹی میٹر کے ارب۔ کھرب حصے کا کھرب واں سینٹی میٹر لمبے ہوتے ہیں یعنی بہت ہی زیادہ چھوٹے۔ کچھ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ شاید کبھی کسی وورم ہول کو اتنا بڑا بنایا جاسکے کہ ان سے انسان یا کوئی خلائی جہاز گزر سکے۔ یا پھر اگر مناسب توانائی اور ضروری ٹیکنالوجی موجود ہو، تو شاید خلا میں ایک بڑا وورم ہول بنایا جاسکے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر ایسا ممکن ہو تو یہ بہت شاندار ہوگا۔ اس وورم ہول کا ایک کنارہ زمین کے نزدیک ہوسکتا ہے اور دوسرا دور، بہت دور کسی دراز سیارے کے پاس۔

وورم ہول کے دونوں سرے اگر ایک ہی جگہ ہوں اور ان

میں فرق صرف وقت کا ہو، تو وورم ہول کے ایک سرے سے داخل ہونے کے بعد جہاز جب دوسری طرف زمین پہ نکلے گا تو وہ ماضی میں ہوگا۔ ہوسکتا ہے وہ ڈائنوسارز کے زمانے میں جا نکلے اور وہاں موجود ڈائنوسارز اس جہاز کو اترتے ہوئے دیکھیں۔

میرا یہ خیال ہے کہ اس طرح کے وورم ہولز نہیں ہو سکتے اور اس کی وجہ فیڈ بیک ہے۔ اگر آپ کبھی کسی میوزک پروگرام میں گئے ہوں تو شاید آپ میوزک کے ساتھ ایک چیختی ہوئی آواز (اسکریچنگ) بھی سن سکتے ہوں۔ یہ فیڈ بیک ہے۔ آواز مائک اور تاروں سے ہوتی ہوئی ایمپلی فائر میں جاتی ہے، جہاں یہ اونچی ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد یہ لاؤڈ اسپیکر سے باہر جاتی ہے لیکن اگر آواز اسپیکر سے مائک میں واپس جانے لگے تو یہ ایک سائیکل سا بن جائے گا اور آواز ہر سائیکل میں اونچی سے اونچی ہوتی چلی جائے گی۔ اگر اس فیڈ بیک کو کنٹرول نہ کیا جائے تو یہ ساؤنڈ سسٹم کو تباہ کر سکتی ہے۔

وورم ہولز کے ساتھ بھی ایسا ہوگا لیکن وہاں آواز کی بجائے تابکاری (Radiation) کا فیڈ بیک ہوگا۔ جیسے ہی ایک وورم ہول بڑا ہوگا، قدرتی تابکار شعاعیں (نیچرل ریڈی ایشن) اس میں داخل ہونا شروع ہوجائیں گی۔ فرض کریں کہ ایک وورم ہول ہے جس میں قدرتی ریڈی ایشنز داخل ہوتی ہیں اور واپس آتی ہیں اور اس طرح آنے جانے کا ایک حلقہ بنا دیتی ہیں۔ تابکاری کا یہ فیڈ بیک اتنا زیادہ ہوجائے گا کہ وہ ورم ہول کو تباہ کردے گا۔ اس لیے اگرچہ چھوٹے چھوٹے وورم ہولز موجود ہیں، شاید کبھی ایسا ممکن بھی ہوسکے کہ ان کو بڑا کیا جاسکے، لیکن وہ اتنا عرصہ نہیں بچ پائیں گے کہ ان کو ٹائم مشین کے طور پہ استعمال کیا جاسکے۔

ماضی میں سفر، چاہے وہ وورم ہول کے ذریعے ہو یا کسی اور طریقے سے، ناممکن ہے۔ اس لیے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ ماضی میں سفر کبھی نہیں کیا جاسکے گا لیکن وقت میں سفر کی کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ میں وقت میں سفر کرنے پہ یقین رکھتا ہوں۔ وقت ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح ہے۔ ہم اس کے دھارے میں بہتے جاتے ہیں۔ یہ ایک اور طرح سے بھی بہتے ہوئے دریا جیسا ہے کہ یہ مختلف مقامات پر مختلف رفتار سے گزرتا ہے۔ رفتار کا یہ فرق مستقبل میں سفر کی کنجی ہے۔ یہ تصور سب سے پہلے البرٹ آئن اسٹائن نے تقریباً ایک سو سال پہلے پیش کیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ کچھ جگہیں ہونی چاہئیں جہاں وقت کی رفتار آہستہ ہوجائے اور کچھ جگہیں ایسی ہوں جہاں وقت تیز رفتار میں چلے۔ اس کا تصور بالکل ٹھیک تھا اور اس کا ثبوت ہمارے بالکل اوپر ہے یعنی خلا میں۔

سٹیلائٹس کے ایک نیٹ ورک (جی پی ایس یعنی گلوبل پوزیشننگ سسٹم) جو زمین کے گرد اپنے مدار میں چکر لگا رہے ہیں، کے مطابق وقت خلا میں زمین کے مقابلے تیزی سے گزرتا ہے۔ سٹیلائٹ کے اندر موجود گھڑیاں ہر روز ایک سیکنڈ کا تیسرا کھربواں حصہ حاصل کرلیتی ہیں۔

یہ مسئلہ گھڑیوں کے ساتھ نہیں ہے بلکہ وقت کے ساتھ ہے۔ خلا میں گھڑیاں تیز چلتی ہیں کیونکہ وہاں وقت تیز رفتاری سے گزرتا ہے جبکہ زمین کے نزدیک، زمین کی کمیت کی وجہ سے وقت کی رفتار کم ہوجاتی ہے۔ آئن اسٹائن نے محسوس کیا کہ وہ مادہ وقت کو کھینچتا ہے۔ اور کسی دریا کے سست روی سے حرکت کرتے ہوئے حصے کی طرح اس کی رفتار کم کرتا ہے۔ کسی جسم میں مادے کی مقدار جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی یہ وقت کی رفتار کم کرنے کی وجہ بنے گا اور یہاں سے مستقبل میں سفر کرنے کا دروازہ کھلتا ہے۔

نوری سال کے 26000 ہماری کہکشاں کے بالکل درمیان میں کہکشاں کا سب سے بھاری جسم موجود ہے۔ یہ ہم سے فاصلے پر واقع ایک جسیم بلیک ہول ہے۔ اس میں 40 لاکھ سورج کے برابر مادہ موجود ہے، جو بلیک ہول کے تجاذب یا کشش (گریویٹی) کے باعث سکڑ کر ایک واحد مقام پہ جمع ہوگیا ہے۔ بلیک ہول کے جتنا نزدیک جائیں گے تجاذب بڑھتا جائے گا۔ بلیک ہول کے بالکل قریب یہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ روشنی بھی فرار نہیں ہوسکتی۔ اس طرح کے بلیک ہول کا وقت کی رفتار پر گہرا اثر ہوتا ہے اور یہ اس کو کم کر دیتا ہے۔ یہ اثر اسے ایک قدرتی ٹائم مشین بنا دیتا ہے۔ میں فرض کرنا چاہتا ہوں کہ کوئی خلائی جہاز کسی دن اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ اگر کوئی اسپیس ایجنسی اس خلائی جہاز کو زمین سے یا خلا میں کسی جگہ سے کنٹرول کر رہی ہو تو وہ دیکھیں گے کہ بلیک ہول کے گرد جہاز ایک چکر 16 منٹ میں مکمل کرے گا لیکن جہاز پر سوار لوگوں کے لیے وقت کی رفتار کم ہوگئی ہوگی کیونکہ یہ بلیک ہول کے نزدیک تجاذب زمین کے تجاذب کے مقابلے میں بے حد زیادہ ہوگا۔ اس تجاذب کے نتیجے میں وقت کی رفتار آدھی رہ جائے گی۔ نتیجتاً جہاز اور اس کے مسافر وقت میں سفر کر رہے ہوں گے۔ فرض کریں کہ خلائی جہاز بلیک ہول کے گرد 5 سال تک چکر لگاتا ہے۔ لیکن زمین پر دس سال گزر چکے ہوں گے۔

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک بلیک ہول ایک قدرتی ٹائم مشین ہے لیکن ظاہر ہے کہ ایسا سفر ممکن نہیں ہے۔ اس ٹائم مشین کو وورم ہولز کے مقابلے میں یہ فائدہ حاصل ہے کہ اس میں پیراڈوکس نہیں ہیں۔ اور فیڈ بیک کی وجہ سے یہ تباہ نہیں ہوسکتا لیکن یہ طریقہ بہت خطرناک ہے اور اس کے لیے بہت دور جانا پڑے گا اور یہ مستقبل میں بہت زیادہ دور بھی نہیں لے جاتا۔ خوش قسمتی سے وقت میں سفر کا ایک اور طریقہ بھی ہے اور ٹائم مشین بنانے کے لیے یہ ہماری آخری امید ہے۔

اس کے لیے آپ کو بہت تیز رفتار سے سفر کرنا ہوگا۔ کائنات میں تیز ترین رفتار روشنی کی ہے ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ۔ اس سے تیز رفتار ممکن نہیں ہے۔ آپ چاہے یقین کریں یا نہ کریں لیکن روشنی کی رفتار سے نزدیک ترین رفتار سے سفر کرنے سے آپ مستقبل میں جا سکتے ہیں۔

اس کے لیے سائنس فکشن کا ایک سپر فاسٹ ٹرین کا ایسا ریلوے ٹریک فرض کریں جو پوری زمین کے گرد گھومتا ہو کیونکہ چاہے کتنی بھی توانائی استعمال کر لی جائے روشنی کی رفتار کو حاصل کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے ہم تصور کرتے ہیں کہ یہ ٹرین روشنی کی رفتار کے قریب ترین رفتار سے سفر کر رہی ہے۔ اس ٹرین میں سوار مسافروں کے پاس مستقبل کا یک سمتی ٹکٹ ہے یعنی یہ مستقبل میں جا تو سکتے ہیں لیکن واپس نہیں آسکتے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ یہ ٹرین کس طرح ایک ٹائم مشین بنتی ہے۔ روشنی کی رفتار حاصل کرنے کے لیے ٹرین زمین کے گرد بہت تیزی سے چکر لگانا شروع کرے گی یعنی ایک سیکنڈ میں سات دفعہ لیکن ٹرین کا انجن کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو اس کی رفتار روشنی کی رفتار سے تیز نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ فزکس کے اصول کے خلاف ہے۔ یہ تصور کریں کہ اس کی رفتار روشنی کی رفتار کے بالکل قریب ہے۔ اب ٹرین میں سوار مسافروں کے لیے وقت آہستہ ہوتا جائے گا بالکل اسی طرح جس طرح بلیک ہول کے نزدیک جانے پر ہوا تھا۔ اب ٹرین پر موجود ہر چیز آہستہ رفتار سے حرکت کرے گی۔ ایسا حد رفتار کو بچانے کے لیے ہوگا۔ اس کو سمجھنے کے لیے فرض کریں کہ ایک بچہ چلتی ٹرین میں آگے کی سمت میں دوڑنا شروع کرتا ہے۔ اس کے دوڑنے کی رفتار ٹرین کی رفتار میں شامل

ہو جائے گی لیکن کیا اس طرح حادثاتی طور پہ حاصل رفتار روشنی کی رفتار سے زیادہ ہو جائے گی؟ اس کا جواب ہے نہیں۔ قدرت کے قوانین اس اصول کہ "کائنات کی تیز ترین رفتار روشنی کی ہے، کو بچانے کے لیے وقت کی رفتار کو آہستہ کر دیں گے۔ اب وہ بچہ حد رفتار نہیں توڑ سکے گا۔ اس قسم کی صورت حال میں وقت کی رفتار ہمیشہ اتنی کم ہو جائے گی کہ طبیعات یہ اصول برقرار رہ سکے۔ اس طرح مستقبل میں لیے سفر کرنا ممکن ہے۔

زمین کی گہرائی میں، ایک 16 میل لمبی گول سرنگ میں چھوٹے ترین ذرات کا ایک دھارا (اسٹریم) موجود ہے۔ جب ان میں توانائی بھیجی جاتی ہے تو ایک سیکنڈ میں ان کی رفتار صفر سے بڑھ کر 60000 میل فی گھنٹہ ہو جاتی ہے۔ توانائی بڑھانے سے ان ذرات کی رفتار بڑھتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ وہ سرنگ میں ایک سیکنڈ میں 11000 مرتبہ چکر لگانے لگتے ہیں جو روشنی کی رفتار کے قریب ترین ہے۔ لیکن ٹرین کی طرح وہ روشنی کی رفتار تک کبھی نہیں پہنچ سکتے لیکن وہ رفتار کے 99-99% نزدیک ہوتے ہیں اور جب ایسا ہوتا ہے تو وہ بھی وقت میں سفر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم یہ اس لیے جانتے ہیں کہ کچھ قلیل المیعاد ذرات جن کو پائی میسون کہا جاتا ہے وہ ایک سیکنڈ کے 25 کھرب ویں حصے میں ختم ہو جاتے ہیں۔ جب ان کی رفتار روشنی کی رفتار کے نزدیک ترین ہوتی ہے وہ 30 گنا زیادہ وقت گزارتے ہیں۔ یہ ذرات حقیقی طور پر وقت کے مسافر ہیں۔ یعنی اگر ہم مستقبل میں سفر کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں صرف تیز رفتار سے سفر کرنا ہوگا۔ بہت تیز رفتار سے۔ میرے خیال میں اگر اس رفتار سے چلنے کی کوئی صورت ممکن ہو سکتی ہے تو وہ صرف خلا میں ہو سکتی ہے۔ اپالو 10 اب تک کا بنایا جانے والا سب سے تیز رفتار خلائی جہاز ہے۔ اس کی رفتار 25,000 میل فی گھنٹہ ہے۔ وقت میں سفر کے لیے اس سے 2000 گنا زیادہ رفتار چاہیے ہوگی۔ اس کے لیے بہت بڑا جہاز چاہیے ہوگا جس کے ساتھ اتنا زیادہ ایندھن ہو جو کہ اس کی رفتار کو روشنی کی رفتار تک جانے کے لیے کافی ہو۔ اس طرح کے جہاز کو سفر کے آغاز کے بعد روشنی کی رفتار حاصل کرنے میں 6 مکمل سال لگیں گے۔ اپنے سفر کے دو سال بعد اس کی رفتار روشنی کی رفتار کے نصف کے برابر ہو چکی ہوگی اور تب تک یہ ہمارے نظام شمسی سے بہت باہر نکل چکا ہوگا۔ مزید دو سال بعد یہ روشنی کی رفتار کی 90 فیصد رفتار سے سفر کر رہا ہوگا۔ اس رفتار پر جہاز وقت میں سفر کرنا شروع کر دے گا۔ اس موقعے پر جہاز میں گزرے ہوئے ہر ایک گھنٹے کے لیے زمین پہ دو گھنٹے گزر چکے ہوں گے۔ یہ بالکل ویسی ہی صورت حال ہوگی جیسے ایک بلیک ہول کے اردگرد گھومنے والے جہاز کی تھی۔ اگلے دو سالوں کے سفر کے بعد جہاز اپنی تیز ترین رفتار حاصل کر لے گا۔ یعنی روشنی کی رفتار۔ اس رفتار کے جہاز پر گزارا ہوا ایک دن زمین پر گزرے ہوئے ایک سال کے برابر ہوگا اور اب یہ جہاز مکمل طور پر مستقبل میں سفر کر رہا ہوگا۔

وقت کی رفتار کے کم ہونے کا ایک اور فائدہ ہے اور وہ یہ کہ ایک انسانی زندگی میں غیر معمولی لمبے سفر کیے جا سکتے ہیں۔ صرف 80 سالوں میں کہکشاں کے دوسرے سرے تک پہنچا جا سکتا ہے لیکن اس تمام سفر کی دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کتنی عجیب ہے۔ اس کائنات میں وقت کی رفتار مختلف مقامات پر مختلف ہے۔ ہمارے اردگرد چھوٹے چھوٹے ورم ہولز موجود ہیں اور ہم بالآخر اپنے طبیعات کے علم کو استعمال کرتے ہوئے چوتھی سمت کے حقیقی مسافر بن جائیں گے۔

■

ترجمہ و تلخیص: سارا

غضنفر

الفت کا پیڑ

آؤ کوئی گیت بنائیں
سب کو میٹھے بول سنائیں
سب کا اس سے دل بہلائیں
گھر گھر میں دیوالی لائیں
ہر آنگن میں عید منائیں

آؤ سب سے ہاتھ ملائیں
دشمن کو بھی گلے لگائیں
نفرت کی دیوار گرائیں
گھر گھر میں دیوالی لائیں
ہر آنگن میں عید منائیں

الفت کا اک پیڑ لگائیں
خوشیوں کے پھل، پھول اُگائیں
اپنی دھرتی کو مہکائیں
گھر گھر میں دیوالی لائیں
ہر آنگن میں عید منائیں

مشکل کو آسان بنائیں
سیدھی سچی راہ دکھائیں
سب کے بیڑے پار لگائیں
گھر گھر میں دیوالی لائیں
ہر آنگن میں عید منائیں

مایوسی کو دور بھگائیں
آس کو اپنے پاس بلائیں
اندھیارے میں جوت جگائیں
گھر گھر میں دیوالی لائیں
ہر آنگن میں عید منائیں

Ghazanfar
Ex. Director, APDUMT
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

ام حبیبہ لکھنوی

رمضاں آیا رمضاں آیا

شور مچاتی ٹولی آئی ۔۔۔ بچوں کی ہمجولی آئی
رمضاں آیا رمضاں آیا ۔۔۔ نیکی کا سندیشہ لایا
اسد اسامہ سیف اللہ ۔۔۔ آؤ کریں سب اللہ اللہ
اس میں ہے اک ایسی رات ۔۔۔ جس میں ہووے سب کی نجات
دادا جی کی ہمت ایسی ۔۔۔ نوے میں بھی رکھتے روزے
لگی افطار میں دادی جان ۔۔۔ بیٹھو سب ہے وقت اذان
افطاری میں آئی جلیبی ۔۔۔ پوری حلوہ اور پکوڑی
لیچی کیلا اور تربوز ۔۔۔ روزے میں یہ بھاتے خوب
تراویح تم کبھی نہ چھوڑو ۔۔۔ قرآن سے تم منھ نہ موڑو
روزوں کی سوغات لایا ۔۔۔ رمضاں آیا رمضاں آیا

■

Umme Habiba Lucknavi
Zamzam House
DS 1194, Sector D, LDA Colony
Knpur Road
Lucknow - 226012 (UP)

غلام حیدر

رِزرو بینک

دُنیا کے جس ملک میں بھی بینکوں کا کاروبار شروع ہوا اور پھیلا وہاں جلدی ہی یہ بات بھی سمجھ لی گئی کہ بینکوں کا کاروبار ایک ایسا گھوڑا ہے جس کے منہ میں لگام نہیں ہے۔ اگر اس کو ذرا بھی بے قابو چھوڑ دیا گیا تو یہ سارے ملک کی معاشی زندگی کو ہی پریشان کر سکتا ہے۔ بینکوں کے ذریعے روپیہ جمع (+) نہیں ہوتا بلکہ ضرب (x) ہوتا ہے۔ یہ بینک اپنی جمع سے کہیں زیادہ رقموں کا اُدھار بھی دے سکتے ہیں اور کاغذی نوٹ بھی چھاپ سکتے ہیں۔ اب فرض کرو کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جب ملک میں روپے کی بہت زیادہ ضرورت نہیں ہے لیکن بینک کو تو صرف اپنے منافع کا خیال ہوتا ہے۔ اگر وہ پہلے ہی کی طرح اُدھار دیتے رہیں تو ملک میں روپیہ بڑھتا ہی چلا جائے گا اور یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کسی مریض کو کھانا نقصان پہنچاتا ہو، ڈاکٹر نے اس پر کھانے کی پابندی لگا رکھی ہو، مگر گھر کے لوگ اُسے برابر کھانے کو دیے جائیں۔

اس لیے شروع سے ہی ملکوں کی حکومتوں نے ایک ایسا بینک ضرور کھولا جس پر خود حکومت کا قابو ہو اور یہ بینک ملک کے باقی بینکوں پر کچھ قابو رکھ سکے۔ ہندوستان میں شروع سے ہی 'پریسیڈینسی بینک' کام کر رہے تھے۔ جنوری 1921 میں ان تینوں 'پریسیڈینسی بینکوں' کو ختم کر دیا گیا یا یوں کہو کہ انھیں ایک دوسرے میں ملا دیا گیا اور ایک نیا بینک 'امپیریل بینک' یعنی شاہی بینک قائم کیا گیا۔

'امپیریل بینک' ویسے تو دوسرے بینکوں جیسا ہی ایک بینک تھا۔ اس کے مالک بھی اور بینکوں کی طرح بہت سے حصے دار تھے۔ یہ بھی رقمیں جمع کرتا تھا اور اُدھار دیتا تھا، لیکن حکومت کے کچھ کام اس کے سپرد کر دیے گئے تھے— جیسے حکومت کا روپیہ جمع رکھنا۔ حکومت کو جب ضرورت پیش آئے اُدھار دینا، حکومت کی طرف سے ہر قسم کا لین دین کرنا وغیرہ۔

اب 1935 کے بعد سے ہمارے ملک کا سب سے بڑا بینک 'رزرو بینک' ہے، اور یہ تمام کام جو کبھی 'امپیریل بینک' کرتا تھا اب صرف 'رزرو بینک' کرتا ہے۔ 'امپیریل بینک' کو 'اسٹیٹ

بینک' کا نام دے دیا گیا ہے اور اب یہ 'رزرو بینک' کے ساتھ حکومت کے ایک مددگار بینک کی طرح کام کرتا ہے۔ شروع میں 'رزرو بینک' کے مالک بھی حصے دار تھے لیکن 1949 میں اسے ہمارے ملک کی آزاد قوم کی ملکیت میں دے دیا گیا۔

کسی بھی ملک کے 'رزرو بینک' کو وہاں کی معاشی زندگی کا 'چوکیدار' کہا جاتا ہے۔ آج کل ہماری معاشیات، روپے کا لین دین، کاروبار بلکہ ہماری زندگی کا خاص طور پر وہ حصہ جس کا تعلق روپے پیسے سے ہے اب سیدھا سادا نہیں ہے بلکہ یہ بہت گنجلک ہو گیا ہے۔ اب اگر اس پر پوری طرح قابو نہ رکھا جائے تو ملک کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔

آج کل معاشی نظام سیدھا سادا نہیں ہے، اِس لیے حکومت کے لیے ضروری ہو جاتا ہے۔ کہ اس پر قابو رکھے، اور اِسی لیے حکومت نے ایک سب سے بڑا بینک 'رزرو بینک' کھولا ہے جو ان بینکوں کے کاروبار پر کئی طریقوں سے قابو رکھتا ہے، اور اِسی لیے اِسے بینکوں کا چوکیدار کہا جاتا ہے۔

حکومت نے ملک میں چلنے والی کرنسی کے سارے کام 'رزرو بینک' کو سونپ رکھا ہے۔ رزرو بینک' ہی حکومت کو بتلاتا ہے کہ ملک میں اِس وقت کتنے روپے پیسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہونے چاہئیں، تاکہ لوگوں کو خرید و فروخت میں چھوٹے بڑے سکوں کے لین دین اور بدلنے میں پریشانی نہ ہو۔ یہ تو تم خود ہی سمجھ سکتے ہو کہ بہت زیادہ پیسے والے لوگوں کو تو بڑے یعنی سو روپے، ہزار روپے وغیرہ کے نوٹوں کی ضرورت پیش آسکتی ہے لیکن ہمارے ملک کے عام آدمیوں کو تو چھوٹے نوٹوں یعنی دو روپے، پانچ روپے اور دس روپے وغیرہ کے نوٹوں کی ضرورت زیادہ پڑتی ہوگی۔ 'رزرو بینک' ملک کی مالی حالت دیکھتے ہوئے ان نوٹوں کو چھپواتا اور چلاتا ہے۔

بینک کے لین دین میں سب سے بڑے گاہک ہماری مرکزی حکومت اور ہمارے ملک کی ریاستی حکومتیں ہیں۔ یہ حکومتیں کارخانوں، بیوپاریوں اور عام لوگوں کی طرح روپیہ بینک میں جمع کراتی ہیں، اپنا روپیہ نکلواتی ہیں، بینک سے اُدھار لیتی ہیں، ضمانتیں رکھتی ہیں، بینک کے ذریعے سے ملک کی جنتا سے اُدھار لیتی ہیں اور ان سے ملک کی ترقی کے لیے منصوبے چلاتی ہیں۔ یہ سارا کام ہمارا 'رزرو بینک' ہی کرتا ہے۔ اس لیے مرکزی حکومت اور ہر صوبائی حکومت کا ایک کھاتہ 'رزرو بینک' میں بھی ہوتا ہے۔

روپے پیسے کے سارے معاملوں میں 'رزرو بینک' ہی

حکومتوں کو مشورہ بھی دیتا ہے۔ ان کے لیے جنتا سے اُدھار جمع کرتا ہے۔ اُدھار اور اس کے سود کی واپسی بھی اسی کے ذریعے ہوتی ہے۔ غرض ملک کے مالی معاملات میں 'رزرو بینک' کی حیثیت کچھ ایسی ہوتی ہے جیسے ہمارے تمھارے جسم میں ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔

کسی بھی ملک کے سامنے ایک سب سے بڑا مسئلہ دوسرے ملکوں سے روپے پیسے کے لین دین اور تجارت کا ہوتا ہے۔ کسی دوسرے ملک کے سکے کے بدلے میں اپنے ملک کا کتنا روپیہ لیا دیا جائے — جیسے ایک امریکی 'ڈالر' کے بدلے میں یا روسی 'روبل' کے بدلے میں یا ایک برطانوی 'پونڈ اسٹرلنگ' کے بدلے میں، یا ایک جاپانی 'ین' کے بدلے میں ہم کتنے روپے انھیں دیں یا ان سے لیں؟ اسے 'زرِ مبادلہ' یا 'Foreign Exchange' کہتے ہیں۔ یہ بڑا مشکل اور الجھا ہوا سا مسئلہ ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کے 'رزرو بینک' کے ہی سپرد یہ معاملات طے کرنا بھی ہے۔ اسی لیے آپ جب کسی دوسرے ملک جاتے ہیں تو 'رزرو بینک' ہی آپ کو اس ملک کا روپیہ دیتا ہے اور اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ کسی دوسرے ملک سے تجارت بھی صرف 'رزرو بینک' کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے۔

چونکہ 'رزرو بینک' تھوڑے تھوڑے دن بعد ملک کی مالی حالت، ملک میں روپے پیسے کے 'پھیلاؤ' کی ضرورت اور اس کی موجودگی وغیرہ کی جانچ پڑتال کرتا رہتا ہے۔ اس لیے اسے معلوم ہوتا ہے کہ کس وقت ملک میں روپے کی مقدار یا اس کا 'چکر' اور 'پھیلاؤ' بڑھانا چاہیے اور کس وقت کم کرنا چاہیے۔

تم نے دیکھا کہ بینک کا کام کچھ گنجلک سا ہوتا ہے۔ یہ اُدھار دیتے ہیں اور ضمانتیں رکھتے ہیں۔ یہ اُدھار دیا جانے والا روپیہ بھی بینکوں کا اپنا نہیں ہوتا۔ ہمارا، تمھارا، یا ان لوگوں کا ہوتا ہے جو بینکوں میں جمع کرتے ہیں۔ اس جمع میں سے یہ تھوڑا بہت اپنے پاس محفوظ رکھ کر باقی کو کاروبار اور اُدھار میں لگا دیتے ہیں۔ اب کبھی کبھی کسی بینک کو ایک دم کچھ زیادہ روپے کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے، یا اس کے پاس ضرورت سے زیادہ روپیہ جمع بھی ہو سکتا ہے۔ خیر زیادہ جمع ہونے میں تو کوئی خاص پریشانی نہیں ہوگی۔ مگر جب ایک دم روپے کی ضرورت پڑ جائے تو بینک کس کے سامنے ہاتھ پھیلائے؟ یہ صحیح ہے کہ بینک کے پاس لوگوں کی ضمانتیں بھی ہوتی ہیں، 'بل آف ایکسچینج' اور ایسی قیمتی چیزیں ہوتی ہیں، جنھیں وہ بیچ کر یا گروی رکھ کر روپیہ حاصل کر سکتا ہے مگر انھیں کھلے بازار میں بیچ کر یا گروی رکھ کر پیسے حاصل کرنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے، اور بینک کو تو فوراً ہی روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب کون ہے جو بینک کو لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کا اُدھار دے گا — ؟ بس ایسے آڑے وقتوں میں یہ بینکوں کا بینک یعنی 'رزرو بینک' ہی ان کے کام آتا ہے۔

ایک اور چھوٹا سا کام بھی رزرو بینک کے ہی ذمے کیا گیا ہے۔ پرانا نوٹ جب گھس کر خراب ہو جاتا ہے تو نیا نوٹ چھاپنے کا کام بھی ریزرو بینک ہی کرتا ہے۔

کسی ملک کی معاشیات یا ان معاملوں میں جن میں روپے پیسوں یا لین دین کا دخل ہوتا ہے، رزرو بینک کتنی اہم اور ضروری جگہ رکھتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ، اگر رزرو بینک نہ ہو تو اب عام کاروباری بینکوں کا کام اتنا گنجلک اور الجھا ہوا سا ہو گیا ہے کہ شاید کام ہی نہ چل سکے۔

■

ماخذ: بینک کی کہانی، مصنف: غلام حیدر، ناشر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

شمیم احمد صدیقی

ہم سے بھی ملاقات کریں

میں انسانوں کی طرح دو ٹانگوں پر کھڑا ہو کر دوڑ تو نہیں لگا سکتا البتہ انسانوں کی طرح ڈانس کر لیتا ہوں اور اُن ہی کی طرح کیلا چھیل کر کھا سکتا ہوں جب کہ زیادہ تر جانور یہ دونوں کام انجام نہیں دے سکتے۔ ہم یا ہمارے بچے انسانوں کی طرح اُردو، ہندی یا انگریزی بول کر اپنے جذبات یا خیالات کا اظہار تو نہیں کر سکتے البتہ ہمارے کنبے قبیلے کے تمام افراد اپنی مخصوص زبان میں آپس میں بات چیت بھی کرتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح اپنے چہرے سے غم و غصہ اور خوشی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ میں اور میرے بھائی بند انسانوں کی طرح روٹی، اناج، انڈے، شہد، کیڑے مکوڑے اور چڑیاں وغیرہ (بغیر پکائے) کھا کر اپنی بھوک مٹاتے اور پانی پی کر پیاس بجھاتے ہیں بلکہ کبھی کبھار تو شہروں میں بسنے والے لاپرواہ لوگوں کا ریفریجریٹر کھول کر اس میں رکھے سامان سے دعوت بھی اُڑا لیتے ہیں۔
میں ضرورت کے وقت بلا تکلف بجلی کے کھمبے پر چڑھ سکتا ہوں، آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر ایک مکان کی چھت سے دوسرے مکان کی چھت پر اور ایک درخت سے دوسرے درخت پر چھلانگ لگا سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ جب کبھی آپ خود یا آپ کے ابو یا امّی مجھے بھگانے کی کوشش کرتے ہیں تو میں اپنا منھ کھول کر خو خو کر کے آپ لوگوں کو دھمکاتا ہوں۔ آپ ماشاء اللہ کافی سمجھدار ہیں کہ میری چند صفات پڑھ کر ہی آپ نے مجھے پہچان لیا کہ میں "ب" سے بندر ہوں۔

دنیا میں ہم بندروں کی لگ بھگ سو قسمیں پائی جاتی ہیں۔ سب سے چھوٹی قسم گلہری کے سائز کی اور صرف دو (2) سوا دو (2.25) کلو وزن کی ہوتی ہے جب کہ سب سے بڑی قسم ایک بڑے کتّے کے سائز کی اور پینتالیس کلو وزن کی ہوتی ہے۔ گو کہ ہمارا چہرہ، سر اور آنکھیں نیز ہمارے ہاتھوں کی ہتھیلیاں، انگوٹھا اور انگلیاں بہت کچھ انسانوں کی ان ہی چیزوں سے ملتی جلتی ہیں حتیٰ کہ ناخن بھی دیگر جانوروں اور چڑیوں کی طرح نوکیلے نہ ہو کر انسانوں جیسے چپٹے ہوتے ہیں لیکن ہم بلیوں کی طرح انسانوں کے ساتھ گھروں میں رہنا

پسند نہیں کرتے بلکہ بالکل آزاد رہ کر درختوں پر بسیرا کرتے ہیں۔ ہماری مادہ یعنی بندریا ایک وقت میں ایک بچہ دیتی ہے اور کبھی کبھار ایک کے بجائے دو بچے بھی پیدا ہوتے ہیں جن کو ماں کے پیٹ میں سات ماہ رہنا پڑتا ہے۔ بچے کئی ماہ تک ماں کا دودھ پیتے ہیں اور جب ماں اشارہ کرتی ہے کہ وہ اب اپنی جگہ سے دوسری جگہ جائے گی یا چھلانگ لگائے گی تو چھوٹا بچہ اس کی چھاتی کے پاس اُگے ہوئے بالوں کو پکڑ کر جھول جاتا ہے جب کہ بڑا بچہ ماں کی پیٹھ پر سوار ہو کر پیٹ کے نیچے ہاتھ باندھ لیتا ہے۔ قدرت نے ہمارے پچھلے حصّہ میں دو گدّیاں بھی بنائی ہیں جن کی وجہ سے ہم دیر تک آرام سے بیٹھ بھی سکتے ہیں اور بیٹھے بیٹھے سو بھی لیتے ہیں۔ ہمارے بچے ساڑھے تین (3½) سال میں جوان ہو جاتے ہیں اور ہماری زائد سے زائد عمر تیس (30) سال ہی ہوتی ہے۔ چونکہ بندر انسان کی نقل اتارنے میں ماہر ہوتے ہیں اور ٹریننگ دینے پر بہت سی حرکتیں سیکھ بھی لیتے ہیں، اس لیے مداری نام کے لوگ ہمارے بچوں کو بہت سے کرتب سکھا کر محلّہ محلّہ جا کر ڈگ ڈگی بجا کر بچوں اور بڑوں کو اکٹھا کر کے بندروں کے بچوں کا ناچ، فرضی شادی، لڑائی وغیرہ دکھا کر پیسے کماتے ہیں۔ اس طرح ہم بندروں کے ذریعے ملک بھر میں ہزاروں انسانوں کی روزی روٹی کا انتظام ہوتا ہے۔ ہم یا ہمارے بچے انسانوں کے کام آئیں، اُن کے لیے روزی مہیا کرائیں تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے لیکن انسان ایسا ناشکرا ہے کہ بجائے ہمارا احسان ماننے کے وا اپنے بھائی بندوں کی کمزوریوں یا غلط حرکتوں کو اُجاگر کرنے کے لیے ہمارا نام بدنام کرتا ہے۔ آپ خود ملاحظہ کریں کہ درج ذیل محاوروں کے ذریعہ حضرتِ انسان نے، جو خود کو اشرف ترین مخلوق کہتا ہے، کس کس طرح مجھ غریب کو ذلیل کیا ہے۔

بندر بانٹ کرنا: اس محاورے کے ساتھ یہ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ دو بلّیاں ایک روٹی پر قبضہ کرنے کے لیے آپس میں جھگڑ رہی تھیں۔ ایک بندر اُن کا جھگڑا نمٹانے کے لیے ایک ترازو لے کر وہاں پہنچا اور مکاری سے اس روٹی کے دو ٹکڑے اس طرح کیے کہ ایک ٹکڑا بڑا ہو۔ ظاہر ہے کہ ترازو میں رکھنے پر بڑے ٹکڑے والا پلڑا جھک گیا، تب دونوں کو برابر کرنے کے بہانے اس نے بڑے ٹکڑے میں سے ایک نوالہ توڑ کر منہ میں رکھ لیا۔ اس بار دوسرا پلڑا نیچے چلا گیا، تب اس نے اس ٹکڑے کے ساتھ بھی پہلی حرکت کی۔ اس طرح دو تین مرتبہ میں پوری روٹی ہضم کر گیا اور بلّیاں اس کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔ لہٰذا یہ محاورہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تقسیم کرنے والا جھگڑا کرنے والوں کا ہمدرد بن کر خود مال ہڑپ کر لیتا ہے۔

بندر کیا جانے ادرک کا سواد(स्वाद): انسان

اس محاورے کو اس وقت استعمال کرتا ہے جب وہ کسی نادان شخص کو کسی نعمت کی ناقدری کرتے ہوئے اور ضائع کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔

بندر کو ملی ہلدی کی گرہ پنسلری بن بیٹھا: یہ محاورہ اُس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی کم ظرف یعنی اوچھی طبیعت کا شخص مال یا دولت مل جانے پر اترانے لگتا ہے اور دوسروں پر رعب جمانے لگتا ہے۔

بندر کی دوستی، جی کا جنجال: یہ محاورہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کسی شخص کو کسی ایسے شخص سے نقصان پہنچتا ہے جس کو اس نے اپنا دوست سمجھا تھا۔

آپ ایمانداری سے بتائیں کہ اپنے جیسے انسانوں کے عیب یا برائی کو اُسی انسان نے، جس کے ہزاروں بھائی بندوں کی روزی روٹی بندروں کا تماشہ دکھا کر مہیا ہوتی ہے، ہم بندروں کو کس دیدہ دلیری سے بدنام کیا ہے۔ کیا انسان کی اس احسان فراموشی اور ذلت آمیز محاوروں کے استعمال سے میرا دل رنج وغم سے ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوتا؟ خالق کائنات بھاگلپور کے نوجوان شاعر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کو ہمیشہ خوش وخرم رکھے کہ انھوں نے میرے ٹوٹے ہوئے دل پر اپنی رباعی کے ذریعہ مرہم رکھنے کا کام کیا ہے۔

ہوتا ہے اُسے رنج و آلام بہت
تکلیف میں رہتا ہے وہ ہر شام بہت
روزی کا بنایا تو وسیلہ لیکن
بندر کو کیا آپ نے بدنام بہت

(ڈاکٹر محمد اسلم پرویز بھاگلپوری)

دنیا میں اچھے بُرے ہر طرح کے لوگ بستے ہیں۔ انسانوں کا ایک طبقہ ہم بندروں کی بڑی عزت کرتا ہے اور ہماری خاطر مدارات کرتا ہے۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ ہنومان جی اور اُن کے ساتھی بندروں کی فوج نے شری رام چندر جی کو راون پر فتح دلانے میں اور سیتا جی کو آزاد کرانے میں بڑی مدد کی تھی، لہٰذا اس عقیدے کے لوگ ہم کو بھگانے یا مارنے کے بجائے اچھی اچھی چیزیں کھلاتے ہیں۔

بندروں کے بارے میں یہ بتاتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے کہ لنگور اپنی لمبی دُم میں لپیٹ کر ہم بندروں کو پٹخ پٹخ کر ادھ مرا کر دیتا ہے۔ اسی لیے ہماری قوم کے لوگ لنگور کو دیکھتے ہی رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض سمجھدار لوگ لنگور پالتے ہیں اور بندروں کی وجہ سے پریشان رہنے والے لوگ لنگور کو کرائے پر لے کر بندروں کو بھگاتے ہیں۔

اب رخصت ہونے سے قبل میں آپ کی ایک غلط فہمی بھی دور کروں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بندر بعض مرتبہ ایک دوسرے کے سر سے کوئی چیز بینتے یا چُنتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ آپ کو یہ غلط فہمی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے سر سے جوئیں نکال کر کھاتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے سر میں خشکی کی وجہ سے پپڑیاں بن جاتی ہیں جو کھانے میں لذیذ ہوتی ہیں ہم اُسی کو نکال کر کھاتے ہیں۔ جوئیں تو آپ انسانوں کے سر میں ہوتی ہیں اور دیہات کے پُرانے لوگ ہم سے اپنے سروں کی جوئیں نکلوایا کرتے تھے۔ آپ بُرا نہ مانیں اور ہماری طرف سے اپنے لیے یہ محاورہ تحفہ میں قبول فرمائیں۔

"انسان کیا جانے بندر کے سر کی پپڑی کا سواد"

■

Dr. Shamim Ahmad Siddiqui
C-2, Naseem Manzil, Madah Ganj
Police Chowki, Seetapur Road
Lucknow - 226020 (UP)

محمد سراج عظیم

کوّے کے پَر

جنگل میں طرح طرح کے پرندے رہتے تھے۔ کچھ چھوٹے کچھ بڑے اور کچھ درمیانہ پرندے۔ ان میں سے بہت سوں کے پر چھوٹے کچھ کے بڑے بڑے، کسی کے بھدے تو کسی کے خوبصورت رنگ برنگے پَر تھے۔ ہاں چمگادڑ کے بھی کالے کالے چھتری نما پر تھے اور تتلیوں کے تو طرح طرح کے ڈیزائن والے مختلف رنگوں کے بہت خوبصورت پر تھے۔ اسی جنگل میں کوے بھی رہتے تھے۔ ان میں کالو نام کا بڑا باتونی اور چنچل کوا بھی تھا۔ کالو کی جنگل کے سارے پرندے طوطے، فاختہ، کبوتر، بگلا، گوریا، مینا، مور سے دوستی تھی۔ وہ سب کے پاس جاتا، خیریت معلوم کرتا اور ان سے کائیں کائیں کرکے بہت دیر تک باتیں کرتا رہتا۔ کچھ لوگ اس کو پسند کرتے تھے تو کچھ لوگ اس کے ملنے اور کائیں کائیں کرنے پر اس سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے مگر کالو کی سب سے اچھی اور بڑی بات یہ تھی کہ وہ پورے جنگل کا چکر کاٹ کر ہر آنے جانے والے اور ہر خطرے کی خبر سب کو دیتا تھا۔

یوں تو کالو عادت کا بہت اچھا تھا لیکن سارے پرندے اس کی کائیں کائیں کرنے والی کرخت آواز اور کالی شکل اور کالے پروں کی وجہ سے اس کو چھیڑتے تھے۔ ان کا جواب وہ کائیں کائیں ہنس کر دیتا بھی کبھی پرندوں سے اس کی لڑائی بھی ہو جاتی اور افسردہ ہو کر وہ خاموش ہو جاتا تھا۔ وہ سوچنے لگتا اللہ پاک نے مجھے کالا کیوں بنایا۔ کاش اللہ مجھے بھی مور کی طرح خوبصورت رنگوں کا بنا دیتا۔ میرے پر مکاؤ طوطے کی طرح کر دیتا اور آواز کوئل کی سی کر دیتا۔ وہ سوچتا رہتا اور خاموشی سے اپنے ماں باپ کے پیڑ پر لوٹ آتا۔

ایک دن آسمان میں بادل چھائے ہوئے تھے شاید بارش ہونے والی تھی۔ ہوا بھی ٹھنڈی چل رہی تھی۔ کالو کو اچھا لگا اور وہ اڑ کر سیر کرنے لگا۔ تبھی اس کی نظر نیچے جنگل میں پڑی۔ اس نے دیکھا کچھ مور ناچ رہے ہیں۔ موروں کے پروں اور پنکھے

کی طرح چمکتی ان کی دم کے رنگ اور ان کا ناچ کالو کو بہت اچھا لگا وہ نیچے موروں کے پاس پہنچ گیا اور کائیں کائیں کر کے ان کی تعریف کرنے لگا۔ سارے مور کالو کی کائیں کائیں سن کر غصہ ہو گئے۔ ان میں انگو نام کا دوست...... فوراً اس کی طرف دوڑتا ہوا آیا اور بہت زور سے ڈانٹتے ہوئے بولا ''اے کالو! اس وقت تو یہاں کیوں آیا؟ تجھے دکھتا نہیں اس سہانے موسم میں کالے بادل دیکھ کر ہم خوشی میں ناچ رہے ہیں'' ''ارے ہاں یار! انگو تمھارے خوبصورت پر اور ناچ مجھے اچھا لگا تو تمھاری تعریف کرنے کے لیے میں نیچے اتر آیا'' اس نے جواب دیا ''ارے جا جا کلوٹے بڑا آیا تعریف کرنے والا آواز سنی ہے اپنی جیسے پھٹا بانس'' انگو ایک دم پلٹ کر بولا، کالو کہاں چپ رہنے والا تھا فوراً بولا ''اے رنگوئے تیری آواز سے تو اچھی ہے تیری تو جیسے پھٹا ہوا باجا۔ اپنے پیر دیکھے ہیں تو نے کالے بھدے دیکھ کر گھن آتی ہے او او'' اس نے الٹی کرنے کے انداز میں کہا۔ کالو کی بات سن کر سارے مور اس کو مارنے کے لیے جھپٹے لیکن وہ کائیں کائیں ہنستا ہوا اڑ کر بھاگ گیا۔''

وہ ایسے ہی ایک دن جنگل سے باہر اڑ کر جا رہا تھا باہر کی خبر لانے، صبح کا وقت تھا سورج نکلنے والا تھا کالو اڑتے اڑتے ندی کے کنارے پہنچ گیا تھا تبھی اس کی نظر ندی کے اوپر ایک قطار میں اڑتے ہوئے سفید بگلوں پر پڑی۔ سارے بگلے ایک ساتھ اڑ رہے تھے۔ یہ منظر اس کو بہت اچھا لگا۔ وہ بھی جلدی سے اڑتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اپنے دوست سفیدو کے قریب پہنچ کر تعریف کرتے ہوئے کہا ''ارے واہ سفیدو تم لوگ سفید سفید ایک قطار میں اڑتے ہوئے بڑے اچھے لگ رہے ہو صبح صبح تم سب کہاں جا رہے ہو''۔

''ہاں ہاں! چل او کالے کلوٹے ہمارے پاس مت آ۔ تجھے دکھائی نہیں دے رہا لوگ ہمیں کتنے غور سے دیکھ رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں۔ ہم لوگ آسمان میں سفید بادل کی طرح لگ رہے ہیں اور تو کلوٹا ہمارے ساتھ آئے گا تو لگے گا جیسے سفید کپڑے پر کالا دھبہ، چل بھاگ یہاں سے'' کالو کو بڑا غصہ آیا لیکن اس کو جنگل کا چکر لگا کر سارے پرندوں کو خبر کرنا تھی اس لیے وہ کچھ نہیں بولا اور واپس جنگل میں چلا آیا مگر وہ سفیدو کی بات سن کر بہت رنجیدہ تھا۔

کالو کے ساتھ اس طرح کی باتیں روز ہوتیں وہ کچھ نہ پاتا کیا کرے۔ ایک دن وہ اپنی آواز، پروں اور سارے پرندوں کا اپنے ساتھ سلوک کے بارے میں سوچتے ہوئے افسردہ تھا۔ پھر اچانک اس کو جنگل میں ڈاکٹر پانڈا کے اسپتال کے بارے میں یاد آیا جہاں پرندوں اور جانوروں کے پر اور دم بدلے جاتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی ''ہاں ٹھیک ہے! تو میں اپنے پر بدلوا لیتا ہوں'' یہ سوچتے ہوئے وہ فوراً ڈاکٹر پانڈا کے اسپتال پہنچ گیا۔ ڈاکٹر پانڈا نے کالو سے پوچھا ''جی بولیے میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں، آپ کچھ بیمار ہیں'' ''نہیں ڈاکٹر صاحب میں بیمار نہیں ہوں۔ مجھے اپنے پر بدلوانا ہیں'' کالو نے فوراً کہا ''اچھا تو آیئے، لیب میں دیکھیے کون سے پر لگوائیں گے'' ڈاکٹر پانڈا لیب میں اس کو لے جاتے ہوئے بولا۔ اس نے لیب میں دیکھا شیشوں میں بہت سے پر لگے ہوئے تھے۔ اس نے بگلے کے سفید پروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر پانڈا سے کہا ''میں یہ پر لگواؤں گا'' ''ٹھیک ہے'' ڈاکٹر نے کہا اور کالو کے بگلے کے سفید پَر لگا دیے۔

کالو نئے پر لگوا کر بہت خوش ہوا۔ ''اب دیکھتا ہوں کون مجھے کالے پروں کا طعنہ دیتا ہے'' کالو دل ہی دل میں مسکراتے

ہوئے سوچنے لگا۔ وہ اسپتال سے باہر آ گیا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا "اب میں بھی آسمان میں اونچا اڑ سکوں گا۔" یہ سوچ کر اس نے اپنے پر پھیلائے اور اڑنے کی جیسے ہی کوشش کی تو وہ اڑ نہیں سکا۔ اس کے جسم میں اتنی طاقت نہیں تھی، وہ زمین پر گر پڑا اور اس کے پر دھول مٹی میں روند گئے۔ "ارے یہ کیا ہوا؟" اس نے خود سے کہا۔ دوبارہ اس نے پھر ہمت کی لیکن پھر بھی وہ اڑ نہیں سکا کیونکہ بگلے کے پر اتنے بڑے تھے کہ وہ ان کو پورا کھول بھی نہیں پا رہا تھا۔ وہ ہانپنے لگا اور تھک کر وہیں پڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور ڈاکٹر پانڈا کے اسپتال میں پروں کو گھسیٹتا ہوا پہنچ گیا۔

ڈاکٹر پانڈا نے اس کو دیکھتے ہی پوچھا "اب کیا ہوا؟"

"ڈاکٹر صاحب یہ پر بہت بڑے اور بھاری ہیں۔ ان سے میں نہ اڑ پا رہا ہوں اور نہ ان کا وزن سہہ پا رہا ہوں" "آپ ان کو بدل دیجیے اور دوسرے پر لگا دیجیے" اس نے ہانپتے ہوئے کہا "ہاں میں جانتا تھا یہ پر تمہارے بس کے نہیں ہیں۔ خیر!" ڈاکٹر پانڈا نے یہ کہہ کر اس سے پوچھا "اب کون سے پر لگانا ہیں" "ڈاکٹر صاحب وہ شوکیس میں الٹے ہاتھ پر مکاؤ طوطے والے رنگین پر" کالو نے اشارہ کرتے ہوئے کہا" "اچھا" کہتے ہوئے ڈاکٹر نے مکاؤ کے پر نکالے اور کالو کے لگا دیے۔ کالو کو رنگین پر اور اپنا جسم اچھا اور ہلکا لگا۔ وہ اپنے آپ ہی آپ مسکرانے لگا "آہ آ! اب جنگل میں مجھے دیکھ کر کوئی ناک بھوں نہیں سکیڑے گا۔ اب میں بھی خوبصورت ہو گیا ہوں۔"

وہ اڑتا ہوا ہریل طوطوں کے جھنڈ میں امرود کے باغ میں پہنچا۔ سارے طوطے اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ یہ دیکھ کر کالو نے اپنی گردن اکڑا لی۔ سارے طوطے اس کو خیریت سے دیکھ رہے تھے۔ "ارے واہ یہ تو بالکل نیا طوطا ہمارے جھنڈ میں آیا ہے" ایک طوطا بولا "ہاں اس کے پر تو دیکھو کتنے خوبصورت ہیں" دوسرا طوطا بولا "تم کہاں سے آئے ہو" کسی نے پوچھا "کالو ابھی تک خاموش تھا اور اپنی تعریفیں سن کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ وہ خوشی میں کائیں کائیں کرنے لگا تبھی جنگل سے مٹھو طوطا اڑتا ہوا آیا اس نے جیسے ہی کالو کی کائیں کائیں سنی تو بولا "ارے یہ دھوکے باز کالو کوا ہے اس نے

کسی مکاؤ کے پر چرا لیے ہیں، اس کو پکڑو" سارے طوطے یہ سن کر کالو کے اوپر جھپٹ پڑے اور اس کو چونچوں سے مارنے لگے، کالو گھبرا گیا اور ان لوگوں کے بیچ سے نکل کر تیزی سے ڈاکٹر پانڈا کے اسپتال کی طرف اڑ گیا۔

جیسے ہی وہ اسپتال پہنچا ڈاکٹر پانڈا آنکھیں لال پیلی کرتے ہوئے بولا "تم پھر آ گئے اب کیا ہوا؟" "کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب میں طوطوں کے جھنڈ میں پہنچ گیا تھا۔ انھوں نے مجھے پہچان لیا اور سب مجھے چور اور دھوکے باز کہہ کر مارنے لگے۔ بڑی مشکل سے بچ کر یہاں آیا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب مہربانی کرکے یہ پر بدل دیجیے" وہ ڈرتا ہوا بولا "تم نے مجھے بہت پریشان کر دیا۔ اب بتاؤ کون سے پر لگاؤں؟ لیکن یاد رکھنا یہ آخری بات ہے اس کے بعد میں پر نہیں بدلوں گا" ڈاکٹر پانڈا غصے میں بولا۔ اس کے بعد کالو نے کبوتر کے سفید رنگ کے کتھئی اور سرمئی دھاریوں والے پر لگوائے اور اسپتال سے باہر آ گیا۔

کالو کو شام ہو گئی تھی بھوک بھی لگ رہی تھی۔ وہ جنگل سے نکل کر پاس کی بستی کے ایک گھر کی منڈیر پر کھانے کی تلاش میں بیٹھ گیا۔ وہیں پاس کی دوسری دیوار پر ایک بلی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے منڈیر پر کالو کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو خوش ہو گئی۔ "واہ واہ بڑا موٹا کبوتر ہے۔ آج تو بہت اچھی شکار کی دعوت ہوگی" یہ سوچتے ہوئے اس نے چٹخارے لیتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری اور دبے پاؤں سے کالو جس منڈیر پر بیٹھا تھا پہنچی اور جیسے ہی نزدیک پہنچ کر اس کو دبوچنے کے لیے چھلانگ لگائی کالو نے بلی کو اپنے اوپر جھپٹتے ہوئے دیکھا تو اس نے اڑنے کے لیے جست لگائی مگر بلی کے پنجے میں اس کی دم کے پر آ گئے۔ اس نے طاقت لگائی اور اڑ گیا مگر اس کی دم کے پر اکھڑ کر بلی کے پنجے میں رہ گئے اس کو بہت درد ہوا۔

کالو ایک بار پھر ڈاکٹر پانڈا کے اسپتال پہنچ گیا۔ ڈاکٹر اس کو دیکھتے ہی غصے میں چیختے ہوئے بولا جاؤ نکل جاؤ! یہاں سے تم مجھے برابر پریشان کر رہے ہو" "نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب، میں پریشان ہو گیا ہوں میں اپنے ہی پر لگوانے آیا ہوں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی، میں دوسروں کے کہنے پر اوروں کی نقل کرنے چلا تھا۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ میں اب کسی کی بھی نقل نہیں کروں گا۔" کالو روہانسا ہو کر بولا۔

ڈاکٹر پانڈا کالو کے معافی مانگنے پر نرم پڑ گیا "دیکھو کالو ہم لوگوں کی رنگت، روپ، پر اور چونچ سب اللہ نے بنائے ہیں۔ ہر ایک کی اپنی خوبی اور اہمیت ہے۔ اس نے ہر پرندے کو الگ مقصد اور کام کے لیے بنایا ہے۔ بے شک تمھاری رنگت کالی اور آواز بھدی ہے لیکن تم جنگل میں جانوروں کو ہر نئے آدمی کے داخل ہونے یا خطرے کے بارے میں اور انسانوں کو ان کے گھر نئے مہمان کے آنے کی خبر دیتے ہو۔ کیا یہ خوبی بگلے، طوطے یا کبوتر میں ہے۔ تمھیں اپنی اس خوبی پر ناز ہونا چاہیے تم کسی سے کم تھوڑے ہی ہو" یہ کہہ کر ڈاکٹر نے کالو کے اپنے پر اس کے لگا دیے "ہاں ڈاکٹر صاحب میں باہری چمک دمک دیکھ کر بھٹک گیا تھا، خواہ مخواہ آپ کو بھی پریشان کیا اور خود بھی تکلیف اٹھائی۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں اب کبھی ایسا نہیں کروں گا" اس نے کہا "شاباش تمھیں اپنی اہمیت کا احساس ہو گیا۔" ڈاکٹر پانڈا مسکرایا۔ "اچھا ڈاکٹر صاحب شکریہ" یہ کہتا ہوا کالو اڑ گیا۔

■

Mohd Siraj Azeem
1-47, Zakir Bagh
Okhla Road, Near Surya Hotel
New Delhi - 110025

جاپانی سے ہندی ترجمہ: شری کرشن
اردو ترجمہ: ذاکر فیضی

بولنے والی رضائی

(جاپانی کہانی)

"اندر آجائیے جناب..... اندر چلے آئیں..... تہہ دل سے آپ کا استقبال ہے۔" تاجر کو دیکھتے ہی سرائے کے مالک نے خوشی سے کہا۔ تاجر بہت دور سے آرہا تھا۔ اسے رات گزارنے کے لیے کسی مقام کی ضرورت تھی، اس نے سرائے دیکھی، سرائے کے مالک سے بات کی اور رات گزارنے کے لیے ایک کمرہ لے لیا۔

اپنا پسندیدہ اور لذیذ کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اسے کمرے میں آوازیں سنائی دیں..... "بھائی جان! کیا آپ کو ٹھنڈ لگ رہی ہے؟"

"کیا تمھیں بھی ٹھنڈ لگ رہی ہے؟" دوسری آواز سنائی دی۔

تاجر نے سوچا 'شاید سرائے کے مالک کے بچے غلطی سے کمرے میں آگئے ہیں۔ یہ امید اس لیے بھی تھی کہ جاپانی سرائے کے کمروں میں دروازے نہیں ہوتے تھے، محض پردے پڑے ہوتے تھے۔

"ش..... ش..... شی..... شی....." تاجر نے کہا۔ "سمجھو! یہ کمرہ آپ کا نہیں ہے"

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی، مگر پھر وہی آوازیں سنائی دیں۔

"بھائی جان! کیا آپ کو ٹھنڈ لگ رہی ہے؟" اور جواب ملتا..... "کیا آپ کو بھی ٹھنڈ لگ رہی ہے؟"

تاجر جھنجھلا کر بستر سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے چراغ روشن کیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ لیکن اسے کوئی دکھائی نہیں دیا۔

اس نے چراغ روشن رہنے دیا اور بستر پر چلا گیا۔ کچھ لمحوں بعد آوازیں پھر سنائی دیں۔ اس نے بغور آوازوں کو سنا۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ آوازیں رضائی میں ہی سے آرہی ہیں۔ اس نے جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹا اور گٹھری بنائی۔ وہ سیدھا سرائے کے مالک کے پاس پہنچا اور تمام بات بتائی۔

"جناب!" سرائے کا مالک غصے میں بولا "لگتا ہے آپ نے کھانا کھانے کے بعد نشہ کر لیا ہے..... اس لیے ایسا کہہ رہے ہیں..... بھلا رضائی بھی کہیں بولتی ہے۔"

تاجر پہلے ہی بہت پریشان ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے کچھ روپے نکالے اور مالک کو دے کر چلا گیا۔

دوسرے دن ایک اور مسافر سرائے میں آیا۔ اس نے بھی کھانا کھایا اور کمرے میں چلا گیا۔ اسے کمرے میں تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اسے بھی وہی آوازیں سنائی دیں۔ وہ مسافر نیچے آیا اور سرائے کے مالک سے کہا کہ رضائی میں سے آوازیں

آ رہی ہیں، وہ یہاں قیام نہیں کر سکتا (رہ نہیں سکتا)۔

اب سرائے کا مالک فکر مند ہو گیا۔ وہ فوراً ہی اوپر کے کمرے میں گیا اور رضائی کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا، اسے بھی آوازیں سنائی دیں۔

''بھائی جان! کیا آپ کو بھی ٹھنڈ لگ رہی ہے؟''

''کیا تمہیں بھی ٹھنڈ لگ رہی ہے؟''

سرائے کا مالک اس رضائی کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ رات بھر وہ اسے اوڑھ کر سویا، تب اس کو معلوم ہوا کہ رات بھر وہ دونوں لڑکے آپس میں یہی سوال کرتے رہے۔

اس واقعے کے دوسرے دن سرائے کا مالک اس دوکان پر پہنچا جہاں سے اس نے رضائی خریدی تھی۔ دوکاندار نے اسے ایک بڑی دوکان پر بھیج دیا، جہاں سے اس نے خرید کر سرائے کے مالک کو فروخت کی تھی۔ اس طرح وہ کئی چھوٹی بڑی دوکانوں کو تلاش کرتے ہوئے ایک چھوٹے سے مکان پر پہنچا۔ جہاں اسے علم ہوا کہ یہ رضائی اس کے مالک نے اپنے ایک کرائے دار سے وصول کی تھی۔

وہ کرائے دار کل چار ممبر تھے، غریب ماں باپ اور ان کے دو چھوٹے چھوٹے بچے۔ باپ کی آمدنی بہت معمولی تھی۔

ایک مرتبہ سردی کے سخت موسم میں ٹھنڈ سے باپ بیمار ہو کر انتقال کر گیا۔ بچوں کی ماں اس صدمے کو برداشت نہ کر سکی اور وہ بھی مالکِ حقیقی سے جا ملی۔

اب دونوں بھائی اکیلے رہ گئے۔ بڑے بھائی کی عمر آٹھ سال تھی اور چھوٹا چھے سال کا تھا۔ دونوں بھائیوں کا اب دنیا میں کوئی نہیں تھا جو ان کی مدد کر سکے۔ دونوں بچوں نے کھانا حاصل کرنے کے لیے گھر میں جو چند برتن تھے، وہ فروخت کرنا شروع کر دیے۔ آخر میں صرف یہ رضائی باقی رہ گئی۔

ایک رات کو دونوں بھائی رضائی اوڑھ کر سو رہے تھے تب چھوٹے نے بڑے بھائی سے معلوم کیا..... ''بھائی جان! کیا آپ کو ٹھنڈ لگ رہی ہے؟''

بڑے نے بھی پوچھا.... ''کیا تمہیں بھی ٹھنڈ لگ رہی ہے؟''

اسی وقت مکان مالک آ گیا۔ اس نے لڑکوں سے کہا..... ''مکان کا کرایا دو۔''

بڑے بھائی نے گڑگڑاتے ہوئے کہا..... ''مالک ہمارے پاس اس رضائی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم آپ کو کرایا کہاں سے دیں؟''

مکان مالک نے غصے سے وہ رضائی ان کے اوپر سے کھینچ لی اور بولا..... ''میں رضائی کو کرائے کی رقم کے بدلے لے جاتا ہوں۔'' اور پھر اس نے دونوں بچوں کو اسی وقت گھر سے نکال دیا۔ اس خطرناک سردی کی رات میں وہ دونوں بچے مکان کے پیچھے ایک دوسرے سے چپک کر بیٹھ گئے۔ اور دوسری طرف مکان مالک کے گھر میں رضائی کے اندر ان کی آوازیں گونجنا شروع ہو گئیں۔ رات میں برف باری ہوئی، بچوں کو شدید ٹھنڈ لگنے لگی۔ پھر وہ سدا کے لیے ٹھنڈے ہو گئے۔

صبح کو ایک شخص نے ان کے مردہ جسم کو دیکھا تو کچھ لوگوں کی مدد سے ان کو دفن کر دیا۔

سرائے کے مالک نے جب یہ دردناک کہانی سنی تو اس کا دل بھر آیا۔ اس نے یہ بات مندر کے پجاری اور گاؤں کے تمام لوگوں کو بتائی۔ وہ رضائی پجاری کو دے دی۔ رضائی سے آوازیں آنا بند ہو چکی تھیں کیوں کہ ان کا پیغام لوگوں تک پہنچ گیا تھا۔

■

Zakir Husain C/o Saifurrahman
Room No.: 131, Kaveri Hostel, JNU
New Delhi - 110067

سید نوشاد بیگم محمود

حکمت سے مسائل حل ہوتے ہیں

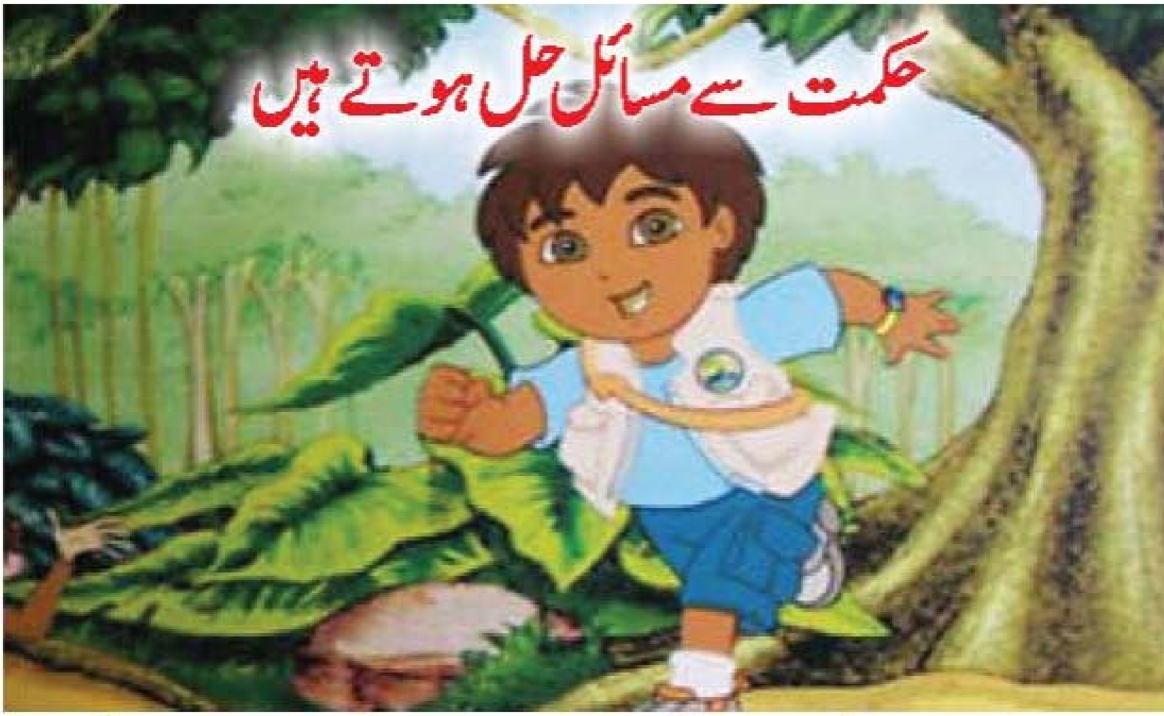

عمران ویسے تو ہوشیار لڑکا تھا۔ کالج کی چھٹی ہوتی تو کبھی بھی گھر پر آرام سے نہیں بیٹھتا۔ چھٹیوں کا استعمال وہ پہاڑ یا جنگل میں گھومنے پھرنے میں گزارتا تھا۔ ایسے ہی ایک مرتبہ اسے جنگل میں گھومتے ہوئے پھلوں سے لدا ہوا ایک درخت دکھائی دیا۔ ان پھلوں کی خوشبو چار سو پھیل رہی تھی اس وجہ سے عمران کی بھوک مزید بڑھ گئی۔ وہ فوراً درخت پر چڑھا اور اس نے چند پھل توڑ کر کھائے۔ جب اس کی نظر اوپر گئی تو اس کے ذہن میں آیا کہ اوپر کی شاخ پر اس سے زیادہ پکے ہوئے پھل دکھائی دے رہے ہیں۔ اس کا لالچ قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اوپر چڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن اوپر کی شاخ اس کا وزن برداشت نہ کر سکی۔ کیونکہ وہ کمزور تھی۔ اس لیے ٹوٹنے لگی۔

عمران نے موقع کی نزاکت کو پہچانتے ہوئے کسی طرح سے دوسری شاخ تھامی اور اس شاخ پر لٹک گیا۔ وہ بہت گھبرا گیا تھا۔ کیونکہ اب کیا کرنا چاہیے اسے سوجھ نہیں رہا تھا۔ جب اس نے نیچے نظر دوڑائی جب اس نے خوف زدہ ہو کر آنکھیں ہی موند لیں۔ میری جان بچانے میں شاید کوئی میری مدد کرے گا اس امید پر وہ زور زور سے چلانے لگا۔

ایک بزرگ آدمی وہاں سے گزر رہے تھے۔ عمران کی آواز سے ان کا دھیان درخت کی جانب گیا۔ تب درخت سے لٹکتے ہوئے ایک لڑکے کو دیکھ کر وہ سوچنے لگے کہ اس کی جان کس طرح بچائی جائے؟ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد ایک ترکیب ان کے ذہن میں آئی اور وہ تھوڑا نیچے کی جانب جھک گئے۔ انھوں نے ایک پتھر اٹھایا اور وہ عمران کی جانب پھینکا۔ عمران درد سے تلملا گیا۔ نیچے دیکھتا ہے تو وہ بزرگ انسان اسے دکھائی دیے۔ اس نے غصے سے کہا یہاں میں موت کی ڈگر پر ہوں۔ مدد کے لیے پکار رہا ہوں اور آپ مجھے مدد کرنے کی بجائے بے رحمی سے پتھر مار رہے ہیں؟ کیا کیا جائے، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کیا آپ کے؟ اس بزرگ نے عمران کی باتوں کی جانب سے

بے توجہی برتی۔ ہاتھ میں دوسرا پتھر لیا اور دوبارہ عمران کے بدن پر پھینک دیا۔ اب عمران بے حد چڑھ گیا۔ اس نے پوری کوشش کر کے خود کو اوپر کی جانب ڈھکیل دیا اور کسی طرح اوپر کی ایک شاخ مضبوطی سے تھام لی اور اس بوڑھے انسان کو دھمکی دی کہ میں نیچے آکر آپ کو دیکھتا ہوں!! اس کے بعد دوبارہ اس شخص نے اس کی باتوں سے لاپرواہی برتتے ہوئے تیسرا پتھر اس کی جانب پھینکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمران کا غصہ مزید بڑھ گیا۔ اس نے بڑی خفگی کے ساتھ اوپر کی شاخ پکڑی۔ اب اس کا ڈر کہیں بھاگ گیا تھا۔ وہ نئے سرے سے ہمت ور بن گیا تھا۔ وہ اس شاخ کی مدد لے کر فوراً نیچے اترا اور چیخ کر کہنے لگا میں بہت خوف زدہ ہو گیا تھا اور موت کے ڈر سے آپ کو مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ مدد کی بجائے آپ مجھے پتھر سے مار رہے تھے؟ کیا کہنا چاہیے آپ کو؟

بزرگ شخص نے ہنستے ہوئے بڑے پیار سے عمران سے کہا ارے بیٹے! تمہارے ذہن میں نہیں آیا۔ میں تو تمہیں ہر ممکن مدد ہی کر رہا تھا۔ ان کے اس بیان سے وہ تھوڑا گڑبڑا گیا۔ اس کے بعد نصیحت آمیز انداز میں معمر شخص عمران سے کہنے لگے۔ ارے جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تب تو تم خوف سے کانپ رہے تھے اور اپنی آنکھیں بھی تم نے بند کر رکھی تھیں۔ خوف کی وجہ سے تمہارا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ میں جب تم پر پتھر پھینکنے لگا تب تمہارا ڈر کم ہونے لگا۔ تم اگرچہ مجھ پر ناراض ہو رہے تھے لیکن تمہارا دماغ کام کر رہا تھا۔ تم مجھے سزا دینے کے متعلق سوچنے لگے تھے۔ اور جب تم سوچنے لگے تب تم نے اپنی مکمل طاقت اکٹھا کر کے اوپر کی شاخ پکڑی اور ہمت پیدا کر کے اترنے میں کامیاب ہو گئے۔ ابتدا میں خود کو بچانے کی ہمت اور اعتماد تمہارے اندر بالکل نہیں تھا۔ نیچے گرتے تو تمہیں پکڑنا بھی میرے لیے ناممکن تھا۔ اس وجہ سے میں تمہاری کھوئی ہوئی خود اعتمادی کو بیدار کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا اور اسی کوشش کو تم نے مناسب تعاون بھی دیا اور تم خود کو بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ میرا کام ہو گیا۔ میں چلتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ بزرگ انسان اپنی راہ چلے گئے۔

تھوڑی سوچ کے بعد عمران کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح آگئی کہ کسی بھی تکلیف دہ حالت یا پریشانی میں صرف گھبرانے کی بجائے مشکل سے نجات حاصل کرنے کے لیے علیحدہ راہیں اور منفرد حکمتِ عملی کو تلاش کر لیا جائے تب ہی ہم کسی بھی الجھن کو سلجھانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جیسے سورج کی روشنی سے برف پگھل جاتی ہے۔ ویسے ہی ہمارے مسائل اپنے علم اور حکمتِ عملی سے دور بھاگ جاتے ہیں۔

■

Syed Noshad Begum Mahmood
Shri Darshan Apatment B/203
Shastri Nagar, Mumbai Puna Road
Kalva - 400605 (Maharashtra)

محمد وکیل

13 مئی یوم ماں

سبھی طفل کو ماں ملے یہ دعا ہے

عورتوں میں ہے پہچان ماں کی
قیمتی سب سے مسکان ماں کی
ماں کا درجہ جسے بھی ملا ہے
سب نے عورت اسی کو کہا ہے
ماں ہے قربانیوں کا ہی پیکر
شفقتوں سے ہے منسوب تیور
زندگی میں جسے ماں ملی ہے
زیست اس کی مکمل کھلی ہے
قرض ماں ، باپ ، استاذ کا اب
کیسے ہوگا ادا سوچ لو سب
جیتے جی قدر ماں کی کرو تم
وقتِ خدمت نہ ہونا کبھی کم
ماں کا دل تم نہ توڑو گے پھر اب
کر لو وعدہ یہ خود سے ابھی جب

تم خدا کی نظر میں رہو گے
سب سے اچھے بشر میں رہو گے
ماں کے قدموں میں رہتی ہے جنت
کرنا تجھ سدا ان کی خدمت
سبھی طفل کو ماں ملے یہ دعا ہے
علیمی کے دل کی بھی اک صدا ہے

■
Md. Wakeel C/o Ahmed Wakeel Aleemi
Holding No.5, B.L.4, P.O: Kankinara
North 24- Parganas - 743126 (West Bengal)

طوطا کہانی

مصنف: محسن خان

مصور: فخر الدین

طوطا نرم بستر پر آرام سے بیٹھ نہیں پا رہا تھا۔ پنکھے کی تیز ہوا بھی اس کے پروں میں لگ رہی تھی۔ وہ بار بار آگے جھکتا اور سنبھلنے کی کوشش کرتا۔ دادی ماں ذرا کھسک کر دور ہو گئیں۔ انھوں نے سوچا، نا سمجھ پرندہ ہی تو ہے اور وہ بھی اتنا بڑا۔ نہ جانے کب بھڑک جائے اور بوٹی اتار لے۔ وہ تسبیح کے دانے گھما گھما کر وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ طوطا اپنی گردن کو ذرا بل دیتا اور پتلیاں نچا نچا کر کبھی دادی ماں کے ہاتھ میں جھولتی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرف دیکھتا تو کبھی کھڑکی کے شیشے سے دکھائی دے رہے آسمان کو دیکھنے لگتا۔

دانش نے کپڑے بدلے اور ہاتھ منہ دھو کر دادی ماں کے کمرے میں آیا۔ اس نے اپنی انگلی طوطے کے پنجوں کے پاس رکھ دی۔ طوطے نے پہلے ایک پنجے سے دانش کی انگلی پکڑی پھر دوسرے پنجے سے اس کی انگلی پکڑ کر آرام سے بیٹھ گیا۔ طوطا تندرست اور وزنی تھا۔ دانش اپنی چھوٹی سی انگلی پر اسے مشکل سے اٹھا پا رہا تھا۔ جب اس نے ہاتھ اوپر اٹھایا تو طوطے نے پروں

کوزرا پھیلا کر اپنے پنجوں سے انگلی کو اتنی زور سے پکڑا کہ دانش کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔
شام کو جب دانش کے پاپا آفس سے آئے تو طوطے کو دیکھ کر وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ انھیں بھی پرندے اچھے لگتے تھے۔ دانش، دانش کی ممی، پاپا اور دادی ماں طوطے کو گھیر کر بیٹھ گئے۔ طوطا دادی ماں کے پلنگ کی چوکھٹ پر ایک پنجے پر کھڑا تھا اس کے دوسرے پنجے میں ہری مرچ تھی جسے وہ اپنی دھاردار چونچ سے کاٹ کاٹ کر بڑے مزے سے کھا رہا تھا۔
دادی ماں اس تماشے میں ایسی کھوئیں کہ وظیفہ پڑھنا ہی بھول گئیں۔ دانش کی ممی کو بھی خیال نہیں رہا کہ آج کھانا پکانے میں دیر ہو گئی ہے۔ دانش کے پاپا آفس کی فائل میز پر رکھنے کے بجائے ہاتھ میں پکڑے بیٹھے رہے۔
جب رات ہو گئی اور سب کے سونے کا وقت آ گیا تو طوطے کو ڈرائنگ روم میں رکھے ہوئے پالنے میں بٹھا دیا گیا۔ جب دانش چھوٹا تھا تو اس کی ممی اسے اسی جھولے میں لٹا کر دھکا دیتی تھیں جھولا گھڑی کی پنڈولم کی طرح ہلتا رہتا اور دانش اس میں مزے سے لیٹا رہتا تھا۔

جب سے دانش کے گھر میں طوطا آیا تھا دانش بہت خوش رہنے لگا تھا۔ اب وہ اپنے سب کام بڑے سلیقے سے کرتا۔ صبح صحیح وقت پر اٹھتا، وقت پر سوتا، اسکول کے کام میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کرتا۔ جب ضروری کاموں سے فرصت مل جاتی تو طوطے کے پاس جاتا۔

اسے کھلاتا، پلاتا اور باتیں کرتا۔ دانش کے پاپا بازار سے ایک بڑا سا پنجرہ لے آئے تھے۔ پنجرے میں ایک جھولا بھی تھا۔ دانش طوطے کو جھولے پر بٹھا کر آہستہ سے دھکا دیتا جھولا ہلتا۔ طوطا خوب مزے سے جھولتا اگر دھکا زور سے لگ جاتا تو طوطا سنبھلنے کے لیے پر پھیلا لیتا اور زور زور سے ٹیں ٹیں ٹیں ٹیں کی آوازیں نکالنے لگتا۔ طوطے کو پنجرے میں اچھا نہیں لگتا تھا وہ پنجرے میں ہوتا تو بے چینی کے ساتھ ادھر ادھر ٹہلنے لگتا۔ تیلیوں کو چونچ سے کاٹنے کی کوشش کرتا اس لیے دانش اپنا ہوم ورک کرتے وقت یا رات کو سونے سے پہلے اسے پنجرے میں بند کر دیتا کہ کہیں بلی اسے پکڑ کے نہ لے جائے۔ ایک دن دانش دادی ماں کے کمرے میں طوطے کو اپنی انگلی پر بٹھا کر اس کا سر سہلا رہا تھا۔ طوطا آنکھیں بند کیے مزے سے بیٹھا تھا۔ دادی ماں وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ دانش نے دادی ماں سے کہا، "دادی ماں میں اسے بولنا سکھاؤں گا"۔

ہاں سکھاؤ۔ پہاڑی طوطے بہت جلدی بولنا سیکھ لیتے ہیں۔ دادی ماں نے کہا۔ مگر بے مطلب کی باتیں نہیں دعائیں اور کلمے سکھانا"۔

"پہلے کون سا کلمہ سکھاؤں؟" دادی ماں۔ دانش نے پوچھا۔ دادی ماں دانش کو بتانے ہی

والی تھیں کہ طوطے نے اپنی گردن ذرا اوپر اٹھائی اور کسی بوڑھے آدمی کی طرح بھاری آواز میں بولا۔ "دادی ماں" دادی ماں کے ہاتھ سے تو تسبیح ہی چھوٹ گئی۔ دانش خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے پہلے کبھی ایسے کسی پرندے کو نہیں دیکھا تھا جو انسانوں کی طرح بولتا ہو۔

"یہ تو بولنے لگا"۔ دانش نے خوب خوش ہوتے ہوئے دادی ماں سے کہا۔ بہت سمجھ دار ہے، تم بار بار دادی ماں دادی ماں کہہ رہے تھے اس نے سیکھ لیا۔ اب تم جو کچھ بولو گے وہ سیکھتا رہے گا۔ دادی ماں نے کہا۔

اتنے میں دانش کی ممی آ گئیں۔ دانش نے ممی سے کہا۔ ممی ابھی طوطا دادی ماں کہہ رہا تھا۔ دیکھیے گا ابھی پھر کہے گا دانش نے طوطے کی طرف جھک کر کہا۔ کہو دادی ماں"۔

طوطا کھڑکی سے باہر کے جانب دیکھنے لگا جیسے اس نے دانش کی بات سنی ہی نہ ہو۔ سب لوگ بڑی محویت سے طوطے کی طرف دیکھ رہے تھے مگر طوطا آنکھوں کی پتلیاں نچا کر کبھی چھت کے پنکھے کی طرف دیکھتا تو کبھی باہر دیکھنے لگتا۔ دانش کا دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے پٹاخہ کے فلیتے میں آگ لگانے کے بعد دل دھڑکتا ہے۔

"جانور اور پرندے اپنی مرضی سے بولتے ہیں۔ جب جی چاہے گا بولے گا"۔ دانش کی ممی نے کہا۔

"مم ابھی بولا تھا اب کیوں نہیں بول رہا ہے"۔ دانش نے کہا

اتنے پریشان کیوں ہو بولے گا۔ دانش کی ممی نے کہا۔

"طوطے نے ذرا گردن اوپر اٹھائی اور بھاری آواز میں بولا"۔ پریشان نہ ہو بولے گا"۔

جاری...

مصنف: جولز ورنی
مترجم: شکیل صدیقی

بارھویں قسط

زمین کی تہہ میں

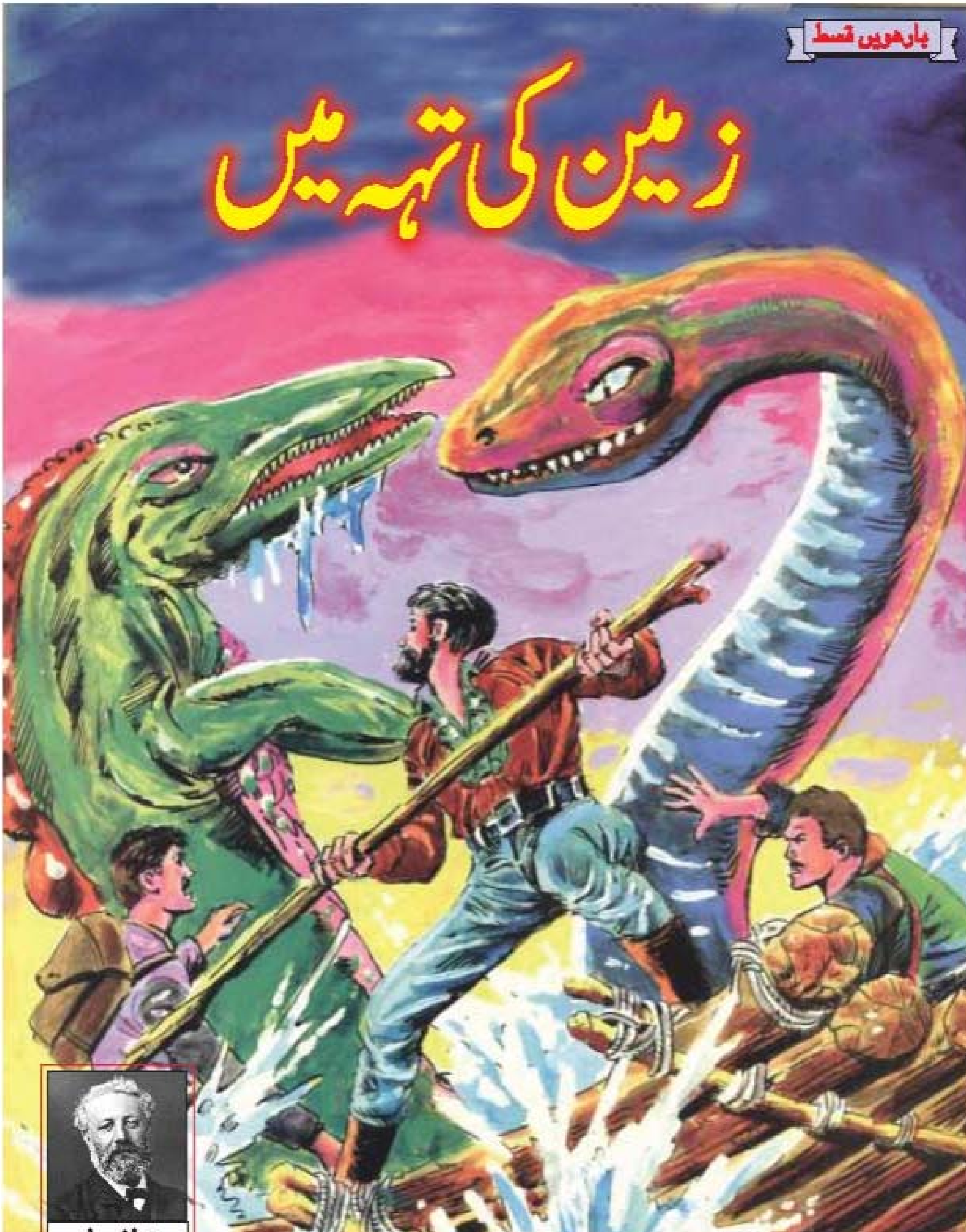

قسط وار ناول

اب تک آپ نے پڑھا کہ پروفیسر لائڈین بروک معدنیات وارضیات کے ماہر تھے۔ وہ بہت قابل شخص تھے اور علاقے میں ان کی کافی عزت تھی۔ ایک دن انھیں سات سو سال پرانی کتاب ہاتھ لگی جو آئس لینڈ کی زبان میں تھی۔ پروفیسر بروک اپنے بھتیجے کے ساتھ رہتے تھے۔ چچا بھتیجے نے اس کتاب کی تحریر سمجھنے کی کوشش کی۔ بہت مشکل سے بس وہ کچھ الفاظ ہی سمجھ پائے۔ پروفیسر لائیڈن بروک کہیں چلے جاتے ہیں اور ادھر بھتیجہ اس تحریر کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے ہوئے بھی پروفیسر کو بتا دیتا ہے کیونکہ اس میں ایک خطرناک سفر پر جانے کی بات تھی۔ تحریر کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد پروفیسر نے سفر پر جانے کی ٹھان لی۔ بھتیجہ (البرٹ) نہیں چاہتے ہوئے بھی تیار ہوگیا۔ آخر کار دو دن بعد لائیڈن بروک اور البرٹ اس خطرناک سفر پر نکل گئے۔ سفر کے لیے انھیں کوپن ہیگن پہنچنا تھا اور وہاں سے آئس لینڈ۔ آئس لینڈ پہنچنے کے بعد ایک رات آرام کیا اور پھر دوسرے دن صبح وہاں کے مشہور آتش فشاں سنیفلز کا سفر شروع کیا۔ سنیفلز پانچ ہزار فٹ بلند پہاڑ تھا۔ کئی طوفان اور دیگر پریشانیوں کا سامنا کرتے ہوئے چچا بھتیجے سنیفلز کی چوٹی پر پہنچتے ہیں۔ چوٹی سے اب آتش فشاں کے اندر اترنے کا خطرناک سفر شروع ہوا۔ دونوں لوگ سنبھل سنبھل کر زمین کی تہہ میں اترنے لگے۔ کئی گھنٹوں کی مشقت کے بعد دونوں تقریباً دس ہزار فٹ نیچے پہنچتے ہیں جہاں انھیں ایک عجیب وغریب منظر دکھائی دیتا ہے۔ آتش فشاں کے لاوے بکھرے پڑے تھے اور ان سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ وہاں سے آگے بڑھتے ہوئے دونوں ایک سرنگ میں داخل ہوئے اور سات گھنٹے کے سفر کے بعد وہ کھلی جگہ میں پہنچے جہاں پودوں اور جانوروں کے ڈھانچے موجود تھے۔ اب دونوں کے پاس پینے کا پانی بھی ختم ہونے والا تھا۔ سفر ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا اور پریشانیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ چٹانوں سے گزرتے ہوئے وہ سب ایک سرنگ میں پہنچے۔ سرنگ سے آگے انھیں کوئلے کی ایک کان ملتی ہے۔ کان میں آگے راستہ بند تھا اس لیے واپس لوٹے، جب تک پینے کا پانی ختم ہوچکا تھا۔ پروفیسر واپس جانے کو تیار نہیں تھے جبکہ البرٹ اور ہانس کو اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی۔ کوئلے کی کان کے بعد تانبے اور ابرق کی کانوں سے گزرتے ہوئے دو دن اور بیت گئے۔ سارے لوگ نڈھال ہوچکے تھے۔ اس درمیان ایک دریا میں پانی بہنے کی آواز آتی ہے۔ بڑی مشکل سے چٹان توڑ کر ہانس نے پانی پینا چاہا لیکن یہ دریا گرم پانی کا تھا۔ بعد میں یہ پانی ٹھنڈا ہوگیا۔ بعد میں البرٹ پروفیسر سے بچھڑ جاتا ہے اور گرینائٹ کی چٹانوں پر پہنچ جاتا ہے۔ البرٹ کی لالٹین بھی بجھ چکی تھی اور گھپ اندھیرا تھا۔ اچانک البرٹ نیچے گرنے لگتا ہے۔ جب البرٹ کو ہوش آتا ہے تو اسے دور سے چچا اور ہانس کی آواز آتی ہے جو اُسے ہی تلاش کررہے تھے۔ بہت مشکل سے البرٹ اپنے چچا تک پہنچتا ہے۔ اس کے بعد سب لوگ دو دن آرام کرتے ہیں۔ پروفیسر نے کہا کہ اب تیار ہوجاؤ، سمندری سفر پر چلنا ہے۔ البرٹ گھبرا گیا کہ یہاں سمندر کہاں ہے۔ پروفیسر بروک نے جواب دیا کہ بحیرۂ بروک ہے اس کا نام، کیونکہ اسے میں نے تلاش کیا ہے۔ ہانس نے آس پاس کے درختوں کی لکڑیوں سے ایک بیڑا تیار کیا اور وہ سب لوگ اس بیڑے میں بیٹھ کر اس عجیب وغریب سمندر میں اتر گئے جو زمین سے اٹھاسی میل نیچے تھا۔ سمندر میں کچھ آگے جانے پر کنارہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ چچا بھتیجے نے مچھلی پکڑ کر بھوک مٹائی۔ 24 گھنٹے گزر چکے تھے۔ لیکن دوسرا کنارہ اب تک نظر نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر بعد سمندر میں وہیل جیسا عجیب وغریب جانور دکھائی دیتا ہے پھر ایک دوسرا جانور پلیسیوسرس نظر آیا اور ان دونوں میں جنگ شروع ہوگئی۔ یہ جنگ بیڑے کے قریب ہورہی تھی۔ لوگ دم سادھے یہ عجیب وغریب جنگ دیکھ رہے تھے۔ سات دنوں کے بعد بیڑا ایک جزیرے پر پہنچتا ہے۔ جزیرے پر کچھ وقت گزار کر پھر سے سمندری سفر پر روانہ ہوگئے۔ سمندر میں چلتے چلتے موسم خراب ہونے لگا اور ان کا بیڑہ سمندری طوفان میں پھنس گیا۔ سمندری لہروں نے انھیں ساحل پر اچھال دیا۔ یہاں آکر پروفیسر نے اندازہ لگایا کہ اب تک وہ چھ سو بیاسی میل سفر کرچکے ہیں اور آئس لینڈ سے ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلے پر تھے۔ اب آگے

حیرت ناک دریافت

میں نے کسی شخص کو پہلے اتنا تعجب کرتے اور پھر غصہ کرتے نہیں دیکھا۔ ان سب خطرات اور حالات سے کیا ہمیں دوبارہ گزرنا ہوگا؟

"ہوا، آگ اور پانی نے مل کر میرا راستہ روکنے کی کوشش کی، مگر وہ نہیں روک سکتیں۔" چچا جان چیخے۔ "وہ دیکھ لیں گی کہ میں کتنا طاقتور اور حوصلہ مند ہوں۔ میں اس سفر کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

میں نے انھیں خاموش کرانے کی کوشش کی۔ "میری بات سنیے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہم ناممکنات کو ممکن نہیں بنا سکتے۔ کوئی بھی ہوا کے مخالف ہزار میل کا سفر ان سڑے بسے درخت کے تختوں، چند کمبلوں اور دو چھڑیوں کے مستول کے ذریعہ سے نہیں کرسکتا۔ اگر ہم اس کی کوشش دوبارہ کریں گے تو دیوانے....."

میں اپنی بات صرف دس منٹ تک جاری رکھ سکا اس لیے کہ جو کچھ میں کہہ رہا تھا۔ پروفیسر اسے قطعی نہیں سن رہے تھے۔

"بیڑے پر چلو۔" وہ چلا کر کہہ رہے تھے اور یہی ان کا جواب تھا۔ انھوں نے اس سلسلے میں میرا کوئی عذر قبول نہیں کیا۔ ان کا ارادہ گرینائٹ سے زیادہ سخت اور ٹھوس تھا۔

ہانس نے تھوڑی دیر پہلے بیڑے کی مرمت ختم کی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ پروفیسر کا کیا ارادہ ہے۔ اس نے سفر کا سب سامان عرشے پر رکھ دیا۔ آسمان بالکل صاف تھا اور ہوا شمال مغرب کی طرف سے چل رہی تھی۔

میں ایسے مالک اور ملازم کے خلاف کیا کرسکتا تھا؟ میں عرشے پر قدم رکھنے ہی والا تھا کہ چچا نے مجھے روک دیا۔

"ہم کل سے پہلے نہیں چلیں گے۔" وہ بولے "اب ہمیں ساحل کے اس حصے کو گھوم پھر کر دیکھنا ہے جہاں اس وقت ہم موجود ہیں۔"

یوں سمجھیے کہ اگر ہم شمالی ساحل پر واپس آگئے تھے تو پورٹ جولی پر یقیناً نہیں پہنچے تھے۔ وہ قدرے مغرب کی طرف تھا۔ اس لیے اس علاقے کا معائنہ کرنا دانش مندی تھی۔

"آیئے اس کو دریافت کرنا شروع کرتے ہیں۔"

ہانس بیڑے کے قریب ٹھہر گیا جبکہ میں اور چچا وہاں سے چل پڑے۔ اس جگہ چٹانوں اور سمندر کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ ہم بڑے بڑے گھونگوں پر پاؤں رکھ کر چلنے لگے جن میں قبل از تاریخ کی مخلوق رہا کرتی ہوگی۔ وہاں ایسے پتھر پڑے تھے جنھیں سمندر نے گول کنکروں میں تبدیل کر دیا تھا۔

"خوب!" میں نے اپنے آپ سے کہا "اس سے کسی حد تک بحیرۂ بروک سمندر کی وضاحت ہوتی ہے۔ زمین میں رخنے اور دراڑیں ہونے کی وجہ سے ہمارے سمندروں کا پانی وہاں داخل ہوا اور ان چٹانوں تک پہنچ گیا۔ پھر یہ پانی گرمی کی وجہ سے بخارات بن کر اُڑ گیا۔ اسی لیے بادل بنے اور بجلی بھی پیدا ہونے لگی۔

فطرت کے اس اصول اور قاعدے پر میں مطمئن تھا۔ میں نے سوچا فطرت کے اصولوں کو طبیعیات کے اصولوں سے ہی ثابت کیا جاسکتا ہے۔

ہم ایک میل تک چلے ہوں گے کہ زمین کی ہیئت تبدیل ہونے لگی۔ وہ کھردری ہوگئی اور کئی جگہوں سے کھوکھلی دکھائی دی۔ ہم قدم جما جما کر چل رہے تھے کہ اچانک ایک ایسے میدان میں پہنچ گئے جہاں دور دور تک ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔

ہڈیوں کی یہ قطاریں افق تک چلی گئی تھیں۔ ہمارے سامنے ایک طرح سے جانوروں کی دنیا کی تاریخ بکھری پڑی تھی۔

ہم آگے بڑھے تو ہڈیاں ہمارے قدموں تلے آ کر چرمرانے لگیں، وہ ایسی ہڈیاں تھیں کہ انھیں حاصل کرنے کے لیے عجائب گھروں میں لڑائی ہو سکتی تھی!

میں اتنا حیرت زدہ تھا کہ میرے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ ان قیمتی ہڈیوں کو دیکھ کر چچا جان کی آنکھیں چمکنے لگیں اور منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ چند منٹ بعد انھوں نے ریت پر سے ایک کھوپڑی اٹھائی "ایلبرٹ..... ایلبرٹ" انھوں نے جوش و جذبات سے کانپتی آواز میں کہا۔ "یہ انسانی کھوپڑی ہے۔"

کھوپڑی ملنے پر چچا کے ہیجان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کو بتا دیا جائے کہ ہم سفر پر روانہ ہونے والے تھے تو یورپ میں کیا ہوا تھا۔

1863 میں فرانس میں ایبی وائل کے نزدیک ایک انسانی جبڑے کی ہڈی پتھر کی چند کلہاڑیوں کے ساتھ زمین سے چودہ فیٹ نیچے دریافت ہوئی تھی۔ یہ انسانی ڈھانچے کی اپنی نوعیت کی پہلی دریافت تھی۔ بہت سے سائنس دانوں کا جن میں پروفیسر بروک بھی شامل تھے خیال تھا کہ یہ کواٹرنیری عہد کا انسان ہے۔ جبکہ دوسروں کا خیال تھا کہ وہ اتنا قدیم نہیں ہو سکتا۔ پھر ایک بحث چل نکلی اور دونوں طرف سے دلیلیں دی جانے لگیں۔

آپ میرے چچا کی خوشی کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انھیں پہلے ایک انسانی کھوپڑی ملی پھر کواٹرنیری عہد کے انسان کا مکمل ڈھانچہ۔

میں حیرت سے خاموش کھڑا تھا۔ میرے چچا جو عموماً زیادہ باتیں کرتے ہیں، وہ بھی خاموش کھڑے تھے۔ ہم نے وہ ڈھانچہ اٹھایا اور اسے ایک چٹان سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ وہ ہماری طرف اپنی کھوکھلی اور بے نور آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

تب میرے چچا ایک بار پھر پروفیسر بن گئے۔ پروفیسر بروک یہ بھول گئے کہ ہم کہاں ہیں، وہ اس سفر کو بھی بھلا بیٹھے۔ وہ تصور کے عالم میں جوہانائم پہنچ گئے جہاں وہ طالب علموں کو لیکچر دے رہے تھے۔ ”طالب علمو! مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں کواٹرنیری عہد کا انسان پیش کر رہا ہوں۔ چند سائنس داں کہہ چکے ہیں کہ وہ ایسے آدمی کے وجود پر یقین رکھتے ہیں، جبکہ کچھ دوسروں کا کہنا ہے کہ وہ نہیں رکھتے۔ ایسی دریافتوں کے بارے میں سائنس کو محتاط رہنا چاہیے۔ کچھ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ یہ کواٹرنیری عہد کے کسی جانور کی ہڈیاں ہیں مگر اس وقت آپ کے سامنے مکمل ڈھانچہ کھڑا ہے جسے آپ دیکھ سکتے اور چھو سکتے ہیں۔“

پروفیسر نے یہاں ٹھہر کر ڈھانچے کو پکڑ کر اٹھا لیا۔

”آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ چھ فیٹ لمبا انسانی ڈھانچہ ہے جو کاکیشس نسل سے تعلق رکھتا ہے۔“ ”ایں.... لڑکو! ہنسو نہیں۔“

وہاں کوئی بھی نہیں مسکرا رہا تھا مگر پروفیسر کو لیکچر کے دوران طالب علم مسکراتے دکھائی دیتے تھے۔

”یہ میں نہیں بتا سکتا کہ یہ یہاں تک کیسے آیا؟“ انھوں نے اپنا لیکچر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”غالباً کواٹرنیری عہد میں زمین پر جو رخنے اور درزیں پڑی ہوں گی یہ ان میں سے پھسل کر یہاں تک پہنچ گیا۔ بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ میری طرح سے ایک سیاح ہے جو یہاں پہنچ گیا ہے، یہ کواٹرنیری عہد کا انسان ہے۔“

پروفیسر نے اپنا لیکچر ختم کیا تو میں نے زور سے تالی بجائی۔ چچا درست کہہ رہے تھے، آگے ہر قدم پر انسانی ڈھانچے ملے جن کے ذریعے سے ہم اپنا نظریہ ثابت کر سکتے تھے۔

پھر ایک خیال سے ہمیں اندیشہ پیدا ہوا اور ہم چونک گئے۔ جب یہ لوگ بحیرہ بروک کے ساحل پر اوپر سے گرے تھے تو مر چکے تھے یا اس مصنوعی آسمان تلے اس دنیا میں پہلے سے رہ رہے تھے؟ ابھی تک ہمیں دو ہی مخلوق ملی تھیں، مچھلیاں یا پھر سمندری عفریت۔ یہ ممکن تھا کہ بنی نوع انسان یہاں زندہ حالت میں موجود ہو۔

ہم اپنے تجسس سے مجبور ہو کر مسلسل آگے بڑھتے رہے اور ہڈیوں کے ڈھیر ہمارے قدموں تلے آ کر چرمراتے رہے۔ یہاں اور کون سا عجوبہ مل سکتا تھا؟ سائنس کے لیے ہم یہاں اور کون سا خزانہ دریافت کر سکتے تھے۔

ہم ساحل سے دور ہوتے جا رہے تھے، مگر پروفیسر اس کی پروا کیے بغیر کہ ہم راستہ بھول سکتے ہیں متواتر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ہم خاموشی سے بجلی کی اس روشنی میں آگے بڑھ رہے تھے جس سے کوئی سایہ نہیں بن رہا تھا۔

ایک میل کے بعد ہم ایک بڑے جنگل کے کنارے پہنچ گئے۔ یہ کھمبیوں کا وہ جنگل تھا جو ہمیں پورٹ جولی پر ملا تھا بلکہ یہ حقیقت میں ٹرٹیری عہد کا جنگل تھا۔ اس کے لمبے درخت اور پودے بھورے اور دھندلائے ہوئے رنگ کے تھے اس لیے کہ انھیں سورج کی روشنی نہیں مل پا رہی تھی۔ ان پتیوں کا کوئی رنگ نہیں تھا اور ان کے پھولوں میں کوئی خوشبو نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کاغذ کے بنے ہوئے ہوں۔

میرے چچا سیدھے اس جنگل میں گھستے چلے گئے، مگر جھجک رہے تھے، میں ان کے پیچھے تھا۔ جانوروں کے لیے وہاں اتنا سارا چارا تھا اس لیے یہ ممکن تھا کہ وہاں بھی کسی عفریت سے ملاقات ہو جاتی۔

میں اچانک ٹھہر گیا اور میں نے اپنے چچا کی کمر تھام لی۔ میرا خیال ہے کہ مجھے کوئی بڑا جانور نظر آیا تھا، کسی جانور کا ڈھانچہ نہیں بلکہ زندہ جانور۔ ہاں، ہاں! میں نے ہاتھی دیکھے تھے

جو درختوں سے پتیاں نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ میں نے قبل از تاریخ زمانے کا جو خواب دیکھا تھا وہ سچ ثابت ہو رہا تھا۔ اب ہم لوگ غیر محفوظ تھے۔

میرے چچا نے ایک دو بار ادھر دیکھا۔ پھر میرا بازو تھام کر بولے۔ "آگے بڑھو۔"

"نہیں۔" میں چلایا۔ "ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ ان خوفناک جانوروں کے درمیان خالی ہاتھ جا کر کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"کوئی خوف ناک جانور؟" میرے چچا نے کہا۔ "تم غلط کہہ رہے ہو۔ مجھے اپنی جیسی مخلوق۔ ایک انسان نظر آ رہا ہے۔"

میں نے نہ چاہتے ہوئے اس طرف دیکھا۔ وہ سچ کہہ رہے تھے۔ تقریباً چوتھائی میل کے فاصلے پر ایک چرواہا درخت سے ٹیک لگائے کھڑا اپنے عظیم گلے کی نگہبانی کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر پہلے ہمیں جو ڈھانچہ ملا تھا، وہ اس کی طرح سے نہیں تھا۔ وہ دیوقامت شخص بارہ فیٹ لمبا تھا۔ اس کے سر کسی گائے کے سر جتنا بڑا اور بال شیر کی طرح سے لمبے تھے۔ اپنے ہاتھ میں اس نے ایک بڑی سی شاخ تھام رکھی تھی۔

جونہی ہماری اس پر نگاہ پڑی تھی ہم ٹھٹک کر رہ گئے تھے اس اندیشے سے کہ وہ ہمیں دیکھ لے گا تو نقصان پہنچائے گا۔ اس لیے ہمیں وہاں سے بھاگنا چاہیے۔

"آیئے..... آیئے بھاگ چلیں۔" میں نے اپنے چچا سے کہا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ میری بات سنی اور اس پر عمل کیا اس طرح سے پندرہ منٹ بعد ہم اپنے دشمن سے کافی دور جا چکے تھے۔

ہم نے جس شخص کو دیکھا تھا، کیا واقعی وہ کوئی انسان تھا؟

آج اس واقعے کو کئی مہینے گزر چکے ہیں لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ کوئی انسان اس زیر زمین دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہمیں یقیناً دھوکا ہوا تھا۔ یہ سوچنا دیوانہ پن ہے۔

بہرحال اس وقت بحیرہ بروک پر جو مناظر ہمیں نظر آئے تھے، انھیں دیکھ کر تو ہم گنگ رہ گئے تھے۔

اس دیوزاد انسان کے علاوہ ہمیں وہاں کئی اور چیزیں بھی دکھائی دیں جن سے پورٹ جولی کی یاد تازہ ہو گئی۔ خیال آیا کہ شاید ہم شمالی کنارے پر پہنچ گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جگہ مجھے وہ چشمہ اور غار نظر آیا جس میں مجھے دوبارہ زندگی ملی تھی لیکن چند قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہر ایک چیز بالکل نئی ملی۔

"ہم نے جہاں سے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ طوفان نے بالکل ٹھیک وہیں لا کر نہیں پھینکا ہے۔ اگر ہم اس ساحل پر مسلسل آگے بڑھتے رہیں گے تو غالباً ہم پورٹ جولی پہنچ جائیں گے۔" میں نے چچا سے کہا۔

"اگر ایسا ہے تو ہم اپنے بیڑے کی طرف بھی واپس جا سکتے ہیں۔ تمھیں یقین ہے کہ تم درست کہہ رہے ہو البرٹ؟" انھوں نے پوچھا۔

"یہ کہنا مشکل ہے چچا جان اس لیے کہ یہ ساری چٹانیں ایک جیسی لگتی ہیں مگر میرا خیال ہے کہ یہ وہی بندرگاہ ہے جہاں ہانس نے بیڑا تیار کیا تھا۔"

"نہیں البرٹ، اگر یہ وہی جگہ ہوتی تو ہمیں کوئی نہ کوئی نشانی ضرور ملتی۔"

"مجھے مل گئی۔" میں چیخا اور تیزی سے اس چیز کی طرف بڑھا جو زمین پر پڑی تھی۔ میں نے اسے اٹھا لیا، اور چچا کو دکھایا۔ وہ ایک زنگ آلود چاقو تھا۔

"اچھا اچھا۔" وہ بولے "تو یہ چاقو اس وقت تمھارے

پاس تھا جب ہم پہلے یہاں تھے۔"

"نہیں میرا نہیں بلکہ آپ کا....."

"یہ میرا نہیں ہے، مگر ہانس کا ہو سکتا ہے وہی ایسے ہتھیار رکھتا ہے۔ اسی نے گرا دیا ہوگا۔"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ہانس کے پاس ایسا چاقو نہیں تھا۔

"تو پھر کیا یہ اسی دیوزاد انسان کا ہے۔" میں نے کہا

"مگر نہیں، اس کا پھل تو فولاد کا ہے۔"

"البرٹ خاموش رہو اور دماغ پر زور ڈالو۔" چچا نے سرد آواز میں قطع کلامی کی۔ "یہ تو سولہویں صدی عیسوی کا ہتھیار ہے۔ یہ نہ تو میرا ہے اور نہ ہی تمھارا۔ یہ ہانس کا بھی نہیں ہے اور نہ یہاں رہنے والے کسی انسان کا۔"

آپ کا مطلب ہے کہ.....؟"

"اس کی طرف غور سے دیکھو۔ ہم ایک بڑی دریافت کرنے جا رہے ہیں۔ یہ چاقو اس ریت پر ایک دو دن سے یا ایک سال سے نہیں پڑا ہوا ہے بلکہ اسے یہاں پڑے ہوئے تین سو سال گزر چکے ہیں اور یہ ان چٹانوں پر پڑے پڑے زنگ آلود ہو گیا ہے۔"

"مگر یہ یہاں خود تو نہیں آیا ہوگا۔" میں چیخا۔ "ہم سے پہلے بھی یہاں کوئی آیا ہوگا۔"

"ہاں، ایک شخص۔"

"اور وہ آدمی۔"

"اس شخص نے اس چاقو سے اپنا نام ان چٹانوں پر کھودا تھا۔ وہ زمین کے مرکز تک جانے والے راستے کی نشاندہی کرنا چاہتا تھا۔ آؤ گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہیں۔"

ہم جوش و جذبے کے ساتھ ان چٹانوں کا جائزہ لینے لگے۔ ہم ہر ایک رخنے اور دراڑ کو دیکھ رہے تھے۔ بالآخر ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سمندر آ کر چٹانوں سے ٹکراتا تھا۔ دو چٹانوں کے درمیان ہمیں ایک تاریک سرنگ دکھائی دی۔ وہاں ایک چٹان پر دو پراسرار حروف کھدے ہوئے تھے جو یہاں آنے والے حوصلہ مند سیاح کے نام کا مخفف رہے ہوں گے۔

"اے۔ ایس۔" چچا نے کہا۔ "آرنی سیکسنم۔ پھر وہی آرنی!"

میں ان دو حروف کو جو تین سو سال پہلے کھودے گئے تھے، دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ہمارے ساتھ جو کچھ پیش آ رہا تھا اس پر ہمیں حیرت ہونی چاہیے تھی۔ اس چٹان پر آرنی کے نام کا مخفف ہی نہیں تھا بلکہ اسے جس چاقو سے کھودا گیا تھا، وہ میرے ہاتھ میں تھا۔ اب مجھے اس شخص اور اس کے عظیم سفر پر یقین آ گیا۔

پروفیسر بروک، آرنی کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔

"شاندار آدمی!" انھوں نے کہا۔ "تم نے اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق ہر وہ قدم اٹھایا جو تم اٹھا سکتے تھے تاکہ دوسرے لوگوں کے لیے یہ زیر زمین میں راستہ کھل سکے۔ تین صدیاں گزرنے کے بعد اب بھی وہ تمھارے قدموں کی رہنمائی میں سفر کر سکتے ہیں۔ تم نے دوسروں کی آنکھوں کے لیے یہ ممکن کر دکھایا ہے کہ وہ ان عجوبات کو دیکھ سکیں۔ تمھارا نام جو اس چٹان پر کھدا ہوا ہے آج لوگوں کی رہنمائی کر رہا ہے جو زمین کے مرکز تک جانا چاہتے ہیں۔ ٹھیک ہے میں بھی گرینائٹ کے اس آخری صفحے پر اپنا نام کھودوں گا۔ سمندر میں یہ راستہ تم نے دیکھا اور دریافت کیا ہے اس لیے میں اسے کیپ آرنی کہوں گا۔"

جب میں نے چچا جان کو اس طرح سے خودکلامی میں

دیکھا تو میری دلچسپی بھی بڑھ گئی۔ میں اس سفر کے خطرات کو بھول گیا، وہ جو کہ پیش آئے تھے اور وہ جو کہ پیش آنے والے تھے۔ آرنی جو کچھ کر چکا تھا میں بھی وہی کروں گا۔

"آگے چلیے..... آگے چلیے۔" میں نے کہا۔

اور جوش میں آگے بڑھنے لگا۔ مگر حیرت انگیز طور پر پروفیسر نے مجھے روک دیا۔

"چلو پہلے ہانس کے پاس چلتے ہیں۔" انھوں نے کہا "اور بیڑے کو یہاں لے کر آتے ہیں۔"

میں نے ان سے اتفاق کیا اور ساحل کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔

"چچا جان۔" میں نے کہا "اب تک قسمت نے ہمارا ساتھ دیا ہے۔"

"البرٹ تمھارا یہ خیال ہے۔"

"ہاں۔ میں اس طرح سے سوچ رہا ہوں۔ حد یہ ہے کہ وہ طوفان ہمارے لیے خوش قسمتی کا باعث تھا۔ موسم اگر خوش گوار ہوتا تو ہمیں بحیرہ بروک کے جنوبی کنارے پر لے جاتا، جہاں جا کر ہم گم ہو جاتے۔ طوفان ہمیں یہاں واپس لے آیا۔ اس طرح سے ہمیں آرنی کا نام مل گیا۔"

"ہاں البرٹ، میں بھی کہوں گا کہ قسمت ہمارا ساتھ دے رہی ہے اس کے سوا اور کوئی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اور اب ہم شمال کی طرف دوبارہ جا رہے ہیں، اور افریقہ کے صحراؤں کے نیچے رینگنے یا اور کسی راستے پر جانے کے بجائے ہم یورپ کے شمالی ملکوں کی طرف جا رہے ہیں۔"

"ہاں البرٹ تم صحیح کہتے ہو۔ ہر ایک چیز درست انداز میں پیش آ رہی ہے۔ اب ہم اس سمندر کو چھوڑ رہے ہیں اور اس کے بعد نیچے اور نیچے جائیں گے۔ تم یقین کرو کہ ہم مرکز سے چار ہزار میل کے فاصلے پر ہیں؟"

"بس ہمیں اتنا ہی سر کرنا ہے؟" میں نے کہا۔ "یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ آیئے چلتے ہیں۔"

جب ہم ہانس کے پاس پہنچے تو اسی موضوع پر دیوانے پن سے گفتگو کر رہے تھے۔ ہر چیز تیار تھی اس لیے ہم کیپ آرنی کی طرف سفر کرنے لگے۔ سست رفتاری سے تین گھنٹے بعد، شام چھ بجے ہم وہاں پہنچ گئے۔ میں بیڑے سے چھلانگ مار کر

ساحل پر پہنچ گیا۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ہمیں بیڑے کو جلا دینا چاہیے تاکہ اگر ہمیں پسپائی اختیار کرنا پڑے تو ہم واپس پلٹ کر اس میں نہ بیٹھ جائیں، مگر چچا جان نے انکار کر دیا۔

"بہر حال ہمیں بغیر کسی تاخیر کے یہ سفر شروع کر دینا چاہیے۔"

"ہاں میرے بچے، مگر اس سے پہلے سرنگ پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے کہ ہمیں سیڑھی کی ضرورت تو نہیں پڑے گی۔"

پروفیسر نے اپنی لالٹین اٹھالی اور میں اس سرنگ کی طرف بڑھ گیا جو بیس گز کے فاصلے پر تھی۔ وہ پانچ فیٹ چوڑی تھی اور اس کی سطح زمین کے برابر تھی، اس لیے ہم کسی دشواری کے بغیر اس میں داخل ہو سکتے تھے۔ تقریباً چھ قدم چلنے کے بعد راستے میں ایک بڑی چٹان آ گئی اور راستہ بند ہو گیا۔

"اوہ نہیں!" میں غصہ میں چلایا۔

ہم نے دائیں بائیں، اوپر نیچے دیکھا کہ شاید کہیں سے نکلنے کا راستہ مل جائے مگر ایسی کوئی جگہ نہیں تھی۔

میں مایوسی سے زمین پر بیٹھ گیا۔ جب کہ چچا جان آگے پیچھے ٹہلنے لگے۔

"مگر آرنی یہاں سے گزرا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں یہ سوچنے کی بات ہے۔" چچا بولے۔ "کیا اس چٹان نے اس کا راستہ بھی روکا تھا؟"

"نہیں نہیں۔" میں نے کہا "جب وہ اپنے سفر سے واپس ہو کر زمین کی سطح تک پہنچ گیا ہوگا تب یہ چٹان راستے پر گر پڑی ہوگی۔ جس طوفان میں ہم گھر گئے تھے ممکن ہے ایسے ہی کسی طوفان کی وجہ سے یہ چٹان گر پڑی ہو۔ بہر حال اگر ہم نے اسے کسی نہ کسی طریقے سے یہاں سے نہیں ہٹایا تو ہم زمین کے مرکز تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے۔"

مجھے حیرت تھی کہ میں نے یہ جملے کیسے ادا کیے۔ شاید مجھ میں پروفیسر کی روح حلول کر گئی تھی۔ میں ماضی کو بھول چکا تھا اور مستقبل سے مجھے نفرت تھی۔ زمین کی اوپری سطح پر میری دلچسپی کے لیے کچھ نہیں تھا، ہمبرگ، کنگس اسٹریٹ اور نہ جولی۔

"ٹھیک ہے تو اسے کلہاڑیوں سے توڑ ڈالتے ہیں۔"

"کلہاڑیوں سے ٹوٹنا مشکل ہے۔"

"تو پھر؟"

"اسے بارود سے اڑایا جا سکتا ہے۔"

"یہ کام ہانس کرے گا۔" چچا نے کہا۔

ہانس بیڑے کی طرف چلا گیا تاکہ بارود اور کلہاڑی وغیرہ وہاں سے لا سکے۔

"ہم یہاں سے ضرور گزریں گے۔" میں نے جوش اور ولولے سے کہا۔

"ہم یہاں سے ضرور گزریں گے۔" میرے چچا نے دہرایا۔

آدھی رات کے قریب ہماری تیاری ختم ہو گئی۔ ہانس نے اس چٹان میں اتنا بڑا سوراخ بنا لیا تھا کہ اس میں بارود بھرا جا سکے۔ پھر اس بارود میں ایک فلیتہ لگا دیا۔ جب ہم فلیتے میں آگ لگانے والے تھے تو اچانک چچا جان نے اعلان کیا:

"اسے ہم کل اڑائیں گے۔"

گویا ہمیں مزید چھ گھنٹے انتظار کرنا تھا۔

■

(جاری)

ماخذ: زمین کی تہہ میں (جولز ورنے کے ناول کا ترجمہ)، مترجم: شکیل صدیقی، ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اشتراک: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سپر بلیو بلڈ مون اور چاند گہن

(Super, Blue Blood Moon & Lunar Eclipse)

2018 کا پہلا چاند گہن 31 جنوری بروز بدھ ہندوستانی وقت کے مطابق شام 6 بج کر 21 منٹ پر شروع ہوا جس کے گواہ دنیا کے بیشتر ممالک بنے۔ 3 گھنٹے 24 منٹ کے طویل چاند گہن کے دوران چاند تین مختلف رنگوں میں نظر آیا۔ اس چاند گہن کو سوپر بلیو بلڈ مون کا نام دیا گیا۔ اس کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

(i) **سوپر مون:** چونکہ اس تاریخ کو چاند اور زمین کا فاصلہ سب سے کم تھا یعنی چاند زمین سے قریب ترین تھا۔ اس لیے اسے سوپر مون کہا گیا جو کہ عام حالات کے مقابلے 14 فیصد بڑا دکھائی دیا۔

(ii) **بلیو مون:** انگریزی مہینے میں 2 بار دکھائی دینے والا چودھویں کا چاند بلیو مون کہلاتا ہے۔ یہ چاند جنوری مہینے کا دوسرا مکمل چاند یعنی بدر کامل تھا۔

(iii) **بلڈ مون:** چودھویں کے چاند کو مکمل گہن لگنے سے سرخی مائل نارنجی رنگ کے نظر آنے والے چاند کو ہی بلڈ مون (Blood Moon) کا نام دیا گیا۔ بلڈ مون کی صورت میں زمین چاند کو پوری طرح ڈھک لیتی ہے مگر جب دھیرے دھیرے سورج کی کرنیں چاند پر پڑنے لگتی ہیں تو اس کا یہ حصہ خون کی مانند سرخ دکھائی پڑتا ہے۔

ان تمام مظاہر کی بنیاد پر 31 جنوری 2018 بروز بدھ ہونے والے چاند گہن کو سوپر بلیو بلڈ مون (Super Blue Blood Moon) کا نام دیا گیا سوپر بلیو بلڈ مون، چودھویں کے عام چاند کے مقابلے 14 فیصد بڑا اور 30 فیصد زیادہ روشن تھا۔

سوپر بلیو مون کا مکمل چاند گہن آخری مرتبہ 31 مارچ 1866 میں لگا تھا۔ اس حساب سے سوپر بلیو مون کا مکمل گہن 151 برسوں میں پہلی مرتبہ دکھائی دیا۔

سائنس دانوں کے مطابق اگلا سوپر بلیو بلڈ مون 31 دسمبر 2028 اور 31 جنوری 2037 میں ہوسکتا ہے۔ یہ دونوں گہن مکمل ہوں گے۔

چاند گہن کے دوران، زمین، سورج اور چاند کے درمیان براہِ راست گزرتی ہے۔ اس دوران چاند زمین کے گھیرے میں آجانے سے کچھ ایسا نظر آتا ہے جیسے کسی چھتری سے ڈھک دیا گیا ہو۔ تاہم ایسے وقت میں سورج کی روشنی سے زمین کا عکس چاند پر پڑتا ہے، جس کی وجہ سے چاند گہن لگ جاتا ہے۔

ماہرین فلکیات کے مطابق آئندہ مکمل چاند گہن اسی سال 2018 میں 27 اور 28 جولائی کی درمیانی شب کو ہوگا۔

■

Ansari Asma bano Saleem Akhtar
House No.16, Madina Park
Near Masood Masjid
Dhule - 424001 (Maharashtra)

سیکڑوں ایجادوں کا موجد: تھامس ایلوا ایڈیسن

ایڈیسن کو بچپن میں اس کے والدین "بے چین اور سوالیہ نشان؟" کے نام سے پکارتے تھے اس نے پوری زندگی روزانہ سولہ گھنٹے کام کیا۔

وہ بلا کا ذہین آدمی تھا۔ وہ بچپن میں شریر تھا اور شرارتیں کیا کرتا تھا۔ لیکن یہ شرارتیں بھی کچھ نہ کچھ جاننے کے لیے ہی ہوتی تھیں وہ رات دن لوگوں سے معلومات حاصل کرتا اور ساتھ ساتھ اپنے طور پر بھی نئی نئی باتیں معلوم کرتا رہتا تھا۔ اس کے نزدیک حقیقت معلوم کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا۔ "کوشش اور صرف کوشش۔"

ایڈیسن دُنیا کا سب سے بڑا موجد (نئی چیز دریافت کرنے والا) تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نے کوئی ایک ہزار ایجادیں کیں۔ وہ مسلسل کوشش کا نمونہ اور قریب قریب ہر مسئلے پر قوم کو بہترین مشورے دیتا تھا۔ وہ میلان (اوہایو) میں 11 فروری 1847 کو پیدا ہوا۔ ابھی بچہ ہی تھا کہ اس کے والدین مچگین چلے گئے۔ وہاں ایڈیسن نے سب سے پہلے گرینڈ ٹرنک ریلوے اسٹیشن پر اخبار فروش کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ کچھ مدت گزرنے کے بعد وہ ایک مال گاڑی میں اپنا ذاتی اخبار بیچنے لگا۔ اس کے بعد تار برقی کی طرف توجہ کی لیکن ایک ماہر 'تار بابو' بن کر بھی اس کو اطمینان نہ ہوا۔ یہاں تک کہ اس نے ایک آلہ ایجاد کیا جس سے کسی 'تار بابو' کی مدد کے بغیر دوسری لائن پر بھی پیغامات بھیجے جاسکتے تھے۔ اس کے بعد اس نے ایک چار رخ کا تار ایجاد کیا اور اس کے ذریعے چلتی ہوئی ٹرینوں کو پیغام پہنچانے کا طریقہ بھی دریافت کرلیا۔

1886 میں ایڈیسن نے اپنے گھر میں لیبارٹیری سے منسلک آلات بنانے کا ایک کارخانہ، منیلو پارک (نیوجرسی) میں قائم کیا، جس کو رفتہ رفتہ بہت شہرت حاصل ہوئی یہاں پینتالیس سال تک مسلسل اس نے بڑی محنت ومشقت سے گزاری۔

ایڈیسن کی مشہور ایجادوں میں چند یہ ہیں۔ فوٹو گراف، مائیکروفون، میمیو گراف، ٹیلیفون کے لیے کاربن کا پیغام رساں اور سب سے بڑی نعمت جو اس نے بنی نوع انسان کو دی۔ وہ بجلی کا بلب ہے جس کے لیے اس نے سالہا سال کام کیا۔ اسے اس کام میں بار بار ناکامی ملی، لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور آخر بجلی کا بلب بنانے میں کامیاب ہوا۔ اس کی اہم ایجاد کنیٹو سکوپ بھی ہے جس نے ترقی پاکر 'سینما' کی شکل اختیار کی۔ ایڈیسن نے اپنی ایجاد فوٹو گرافی کو ترقی دے کر بولتی چالتی تصویریں بناڈالیں۔ نکل اور لوہے کی اسٹوریج بیٹری بھی اسی نے ایجاد کی اور اس کا آخری کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مصنوعی ربڑ بنانے کا طریقہ ایجاد کیا۔ ایڈیسن عمر کے آخری پڑاؤ پر قریب قریب بہرا ہوگیا تھا۔ 18 اکتوبر 1931 کو اس کا انتقال ہوا۔ اس نے 84 سال کی عمر پائی اور ساری زندگی تجربہ گاہ میں گذاردی۔ اس طرح اس عظیم سائنسداں نے اپنے مضبوط ارادے اور سخت محنت سے مشکل کاموں کو بھی انجام دے کر یہ ثابت کردیا کہ انسان کے سامنے کوئی کام مشکل نہیں۔ بس مضبوط حوصلوں کی ضرورت ہے ■

Mohsin Raza
Khirnipura Behind Nagina Masjid, Yawal
Distt: Jalgaon - 425301 (Maharashtra)

شیر شاہ سوری

ایک عادل مسلمان حکمراں، ایک شخصیت

پیارے بچو! شیر شاہ سوری کو تو آپ جانتے ہوں گے، بھلا اس کی تعمیر کردہ سڑکیں اور کارنامے کون بھول سکتا ہے۔ آپ کو اس کے بارے میں کچھ باتیں نہ معلوم ہوں گی۔

آیئے آج ہم آپ کو شیر شاہ سوری کے بارے میں بتاتے ہیں۔ شیر شاہ سوری کا اصل نام فرید خان تھا۔ وہ تقریباً 545 برس قبل یعنی 1486 میں ہندوستان کے ایک علاقے سہسرام بہار میں پیدا ہوا۔ وہ رحم دل اور انصاف پسند بادشاہ تھا۔ اس کا قول تھا کہ انصاف سب سے بڑا مذہبی فریضہ ہے۔ شیر شاہ نے صرف پانچ برس حکومت کی اور وہ بھی بڑھاپے میں لیکن اس تھوڑی مدت میں وہ رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے ایسے کام کر گیا جو تاریخ میں یادگار رہیں گے۔ اتنی کم مدت میں ہندوستان کے کسی بادشاہ نے اتنے زیادہ اور اچھے کام نہیں کیے جو شیر شاہ سوری نے کیے۔ اس نے اپنی سلطنت کے لیے وزارت دفاع اور وزارت خارجہ، مرکزی سکریٹریٹ انصاف و قانون کے محکمے قائم کر رکھے تھے۔ ڈاک سراغ رسانی اور مالیات کے محکمے بھی قائم کیے تھے۔ امن وامان کا قیام، رعایا کی بھلائی، جرائم کا خاتمہ، سلطنت کا استحکام، تجارت میں ترقی، زراعت میں اضافہ، پختہ سڑکوں کی تعمیر اس کے دور کی اہم خصوصیات ہیں۔ اس نے اپنے دور میں چار بڑی سڑکیں بنوائیں۔ پہلی سڑک سنار گاؤں بنگلہ دیش سے شروع ہو کر آگرہ دہلی اور لاہور سے دریائے سندھ تک پہنچتی تھی جس کی لمبائی پندرہ سو میل تھی۔ دوسری سڑک آگرہ سے بنارس تک، تیسری سڑک آگرہ سے جودھ پور اور چوتھی سڑک لاہور سے ملتان تک جاتی تھی۔ ان سڑکوں پر مسافروں کے لیے 1700 سرائے اور گیسٹ ہاؤس تعمیر کرائے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں ٹھہرتے تھے اور ان کی خوراک کا انتظام ہوتا تھا۔ ہر سرائے کے ساتھ مسجد، کنواں اور دروازے پر پانی کے ٹھنڈے ٹھنڈے مٹکے ہوتے تھے۔ اس نے ہندوستان میں امن وامان قائم کر دیا کہ اگر کوئی بڑھیا اشرفیوں سے بھرا گٹھرا جنگل میں اپنے پاس رکھ کر سو جاتی تو اسے اشرفیوں کی حفاظت کی فکر نہیں ہوتی تھی کیونکہ کوئی چرانے والا ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی موت 22 مئی 1545 کو ہوئی۔ ■

Qazi Zia Alam Kosgavi
Hyderabad Marg Indra Gandhi Puram
Sinf Nagar, Hyderabad - 500018 (Telangana)

انصاری تحریم

مہکتی کلیاں

- جو شخص خدا سے ڈرتا ہے وہ کبھی بدلہ نہیں لیتا۔
- کھانے کو ٹھنڈا کرلیا کرو گرم کھانے میں برکت نہیں۔
- دوست ایسا بناؤ جو تمھاری ناراضگی سے ناراض نہ ہو اور تمھاری غلطیوں کو بتا کر ان کی اصلاح کرے۔
- کسی پر کیچڑ مت اچھالو، کیونکہ اس تک پہنچے گا بعد میں پہلے تمھارے ہاتھ گندے ہوں گے۔
  نفرت ایک ایسا پھول ہے جو اگر دل میں کھل جائے تو تمام عمر سسکنا پڑتا ہے۔
- لعنت ہو اس دل پر جس میں دوسروں کے درد کا احساس ہی نہ ہو۔
- آپ کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ کسی کے دل پر زخم لگا سکتا ہے اور کسی کے دل کا مرہم بن سکتا ہے فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ آپ کی زبان سے کون سا لفظ نکلے۔
- انھیں کبھی نظر انداز مت کرو جو تمھاری غلطیوں کو معاف کردیں جو تمھاری پروا کرتے ہیں ورنہ ایک دن تمھیں احساس ہوگا کہ پتھر جمع کرتے کرتے تم نے ہیرا کھو دیا ہے۔
- جو بہت خوش نظر آتا ہے تو یہ نہ سمجھ لینا کہ وہ کتنا زیادہ خوش ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو اس کے دکھ سن کر تمھیں شرمندہ ہونا پڑے۔
- سچا دوست اگر ناراض ہو جائے تو اس کو بار بار مناؤ کیونکہ ہیروں کی مالا ٹوٹ کر بھی ہیروں کی مالا کہلاتی ہے۔
- ہمیشہ سچ بولیں کیونکہ جیت آخر سچ کی ہی ہوتی ہے۔

■

Ansari Tahreem Bano Sajid Husain
Maulvi Ganj, Dhule (Maharashtra)

عرشیہ بی صابر بیگ

پھول

- وفا کرنی ہو تو پھولوں سے سیکھو جو شاخ سے جدا ہو کر مرجھا جاتے ہیں۔
- خوش اخلاقی ایک پھول ہے جس کی خوشبو سے سب لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔
- پھول خود توہین برداشت کرلیتا ہے اور بدلے میں پھولوں کا تحفہ دیتا ہے۔
- خدا بڑی بڑی سلطنتوں سے خفا ہوسکتا ہے لیکن چھوٹے چھوٹے پھولوں سے کبھی ناراض نہیں ہوسکتا۔
- صورت بغیر سیرت کے ایسا پھول ہے جس میں کانٹے زیادہ ہوں اور خوشبو بالکل نہ ہو

■

Arshia Sabir Beg
Al-Hasnat Urdu High School
Rasulpur (Maharashtra)

قریشی شارفہ شیرین نعیم اختر

میں کون ہوں؟

میں بہت بڑا جانور ہوں۔ میری ٹانگیں بہت لمبی ہیں۔ گردن بھی لمبی ہے۔ دم چھوٹی سی ہے۔ میری پیٹھ ٹیلے کی طرح ابھری ہوئی ہے۔ میرا ہونٹ نیچے لٹکا ہوا ہے۔ دیکھنے میں بے ڈھنگا نظر آتا ہے مگر کام کا جانور ہوں۔ اپنے مالک کو ریت کے بڑے بڑے میدان پار کرا دیتا ہوں۔ سوکھی جھاڑیاں اور کانٹے کھا کر اپنا پیٹ بھر لیتا ہوں۔ بغیر پانی کے بہت دنوں تک زندہ رہ سکتا ہوں۔ بتاؤ میں کون ہوں؟

■

Qureishi Sharifa Sheerin Nayeen Akhtar
Malegaon (Maharashtra)

■ رزینہ فردوس ساجد حسین

سنہرے حروف

- جس طرح لوگ مردہ لوگوں کو کندھا دینا ثواب سمجھتے ہیں اسی طرح لوگ زندہ لوگوں کو سہارا دینا افضل سمجھ لیا کریں تو زندگی آسان ہو جائے گی۔
- کسی کے خلوص اور پیار کو اس کی بے وقوفی مت سمجھو ورنہ کسی دن تم خلوص اور پیار کرو گے اور لوگ تمھیں بے وقوف سمجھیں گے۔
- موبائل اور دل اتنے پاک رکھو کہ جب کوئی کھول کر دیکھے تو شرمندگی نہ ہو۔
- غلطی پر ساتھ چھوڑنے والے تو بہت مل جاتے ہیں، لیکن غلطی پر سمجھا کر ساتھ نبھانے والے بہت کم ملتے ہیں۔
- جنھیں خواب دیکھنا اچھا لگتا ہے انھیں رات چھوٹی لگتی ہے اور جنھیں خواب پورا کرنا اچھا لگتا ہے انھیں دن چھوٹا لگتا ہے۔
- جب غلطی ثابت ہو جاتی ہے تو عقلمند اپنے آپ کو درست کر لیتا ہے اور جاہل ضد پر اڑا رہتا ہے۔
- گفتگو ایک ایسا عمل ہے، جس کی وجہ سے انسان لوگوں کے دل میں اتر جاتا ہے یا لوگوں کے دل سے اجڑ جاتا ہے۔

■

Razina Firdaus Sajid Husain
Mhdhopura Ilahi
Tanzimi Idare ke Samne
Dhule (Maharashtra)

■ شیخ عاطف محمد

سنہری باتیں

- زندگی میں دو باتیں ہمیشہ یاد رکھنی چاہئیں کہ غصہ کی حالت میں کوئی فیصلہ نہ کریں اور خوشی کی حالت میں کوئی وعدہ نہ کریں۔
- خوش رہنا چاہتے ہو تو دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش کرو۔
- جب غصہ تم پر غلبہ پائے تو خاموشی اختیار کرو۔
- نصیحت کرنا آسان ہے لیکن حل بتانا مشکل ہوتا ہے۔
- انسان سوچتے وقت فی منٹ 14 مرتبہ سانس لیتا ہے۔
- سورج چاند سے 400 گنا بڑا ہے۔
- پھلوں میں سب سے کم کیلوریز کھیرے میں ہوتی ہے۔
- دنیا میں بولی جانے والی زبانوں کی جملہ تعداد 6000 ہے۔
- عورت کے خون میں مرد کی بہ نسبت سرخ خلیے 20 فیصد کم ہوتے ہیں۔
- الو اپنا سر پورے دائرے میں گھما سکتا ہے۔
- دنیا کی عزت مال سے اور آخرت کی عزت اعمال سے ہوتی ہے۔
- اصلی کمال علم اور عمل دونوں کو جمع کرنے میں ہے۔
- موت کو یاد رکھنا نفس کی تمام بیماریوں کا علاج ہے۔
- کردار انسان کا وہ حسن ہے جسے زوال نہیں۔
- ایک جھوٹ سے بہت سے جھوٹ جنم لیتے ہیں۔
- جب تمھیں وراثت میں مفلسی اور تنگ دستی ملے تو نیکی اور شرافت کو اپنا سرمایہ بنا لو۔

■

Shaikh Aatif Mohammed
Nida Urdu Junior College
Udgir, Distt: latur - 413517 (Maharashtra)

آپ کا دماغ کتنا تیز ہے؟

دوستو! یہ دونوں تصویریں دیکھنے میں تو ایک جیسی لگتی ہیں لیکن تصویروں کی نقل بنانے والے سے ایک دو نہیں بلکہ دس غلطیاں ہوگئی ہیں۔ کیا آپ ان غلطیوں کو تلاش کرسکتے ہیں؟ 10 منٹ میں اگر آپ نے تمام غلطیاں تلاش کرلیں تو سمجھیے کہ واقعی آپ کا دماغ بہت تیز ہے۔

■ جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں

گلزار احمد

ہاتھی سے جنگ

ایک مرتبہ کی بات ہے کہ کسی جنگل میں بہت سارے ہاتھی رہا کرتے تھے اور وہ جنگل میں جدھر بھی جاتے تھے تو ایسا معلوم پڑتا تھا جیسے کہ پورے جنگل میں آندھی طوفان آگیا ہو۔ ایک مرتبہ کی بات ہے کہ سارے ہاتھی ایک ساتھ ندی کی طرف جارہے تھے اور اسی راستے میں خرگوش کا گھر بھی تھا۔ جب خرگوش نے دیکھا کہ ہاتھیوں کا جھنڈ اس کی بستی کی طرف سے ہوکر ندی میں جائے گا تو سارے خرگوشوں میں کھلبلی مچ گئی اور وہ اپنی جان بچانے کے لیے ایک دوسرے کی پرواہ کیے بغیر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔

انھیں خرگوشوں میں سے ایک ننھا خرگوش بھی تھا جس نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ہاتھیوں کو دیکھا تھا (اور وہ بھی جھنڈ کے جھنڈ) تو وہ ایک کھوکھلے درخت میں جو کہ نزدیک ہی تھا چھپ گیا۔ جب کچھ دیر کے بعد اسے اطمینان ہوگیا کہ ہاتھی چلے گئے ہوں گے تب وہ باہر نکلا اور اپنی بستی والوں کو دیکھا کہ بہت سارے مر چکے تھے اور بہت سارے زخمی ہوگئے تھے۔ اس حادثے کے بعد ننھے خرگوش کو بہت زیادہ صدمہ ہوا اور اسی دن سے اس نے طے کرلیا کہ ہاتھیوں سے ضرور بدلہ لے گا۔

ایک دن ننھا خرگوش جنگل میں اداس بیٹھا تھا تو اسی وقت ایک گلہری آئی اور اس نے خرگوش کی خیریت دریافت کی۔ خرگوش نے غم زدہ لہجے میں ساری داستان بیان کی تو گلہری بھی بہت اداس ہوگئی اور دونوں نے مشورہ کیا کہ ہم ان ہاتھیوں سے ضرور بدلہ لیں گے اور دونوں جنگل کے دوسری طرف جانے لگے۔ اتنے میں ان دونوں کی ایک چیونٹی سے ملاقات ہوئی۔ دونوں نے چیونٹی سے خیریت دریافت کی تو چیونٹی نے بھی اپنا درد بیان کیا کہ سارے گنّوں کو ہاتھی ختم کردیتے ہیں، اس لیے چیونٹیوں کے لیے کوئی میٹھی چیز نہیں بچتی ہے۔

اس کے بعد تینوں نے سوچا کہ کس طرح بدلہ لیا جائے۔ تبھی گلہری نے مشورہ دیا کہ کسی انسان سے ہم لوگ مشورہ کرلیں۔ اسی وقت وہ لوگ جنگل کے باہر کھیت میں گئے جہاں ایک کسان کھیت جوت رہا تھا۔ جب ان تینوں نے اپنا حال اس کسان سے بتلایا تو کسان نے ایک ترکیب بتائی کہ کسان کے پاس (بھیلی) گُڑ تھا۔ اس نے اسے پانی میں بھگو کر شربت تیار کیا اور گلہری سے کہا کہ اسے اپنے دُم میں لگا کر سارے ہاتھیوں کے سونڈ میں لگا کر آئے۔ گلہری نے جب یہ کام کرلیا تو اس کے بعد اس کسان نے اس سے کہا کہ ایک مرتبہ اور یہ شربت اپنے دم میں لگا کر چیونٹیوں کی بستی سے لے کر ہاتھیوں کی بستی تک راستے میں لگا کر آئے جب گلہری نے یہ کام بھی پورا کرلیا تو چیونٹی کی فوج میٹھی خوشبو پا کر اس بستی کی طرف روانہ ہوئی اور سارے ہاتھیوں کے سونڈوں میں گھس گئی اور انھیں تباہ و برباد کردیا۔ اس طرح ان لوگوں نے ہاتھیوں سے اپنی جان چھڑائی اور سب مل جل کر ایک ساتھ جنگل میں رہنے لگے۔

■

Gulzar Ahmad
Jamia Islamia Muzaffarpur
Azamgarh - 276302 (UP)

شیخ آفتاب سلیم، درجہ: ہشتم (الف)
رضوان حارث آئیڈیل ہائی اسکول، تھانے، مہاراشٹر

شیخ مجاہد عرفان ضیاء، درجہ ہشتم (الف)، اقرا شاہین قاضی اردو ہائی اسکول، مہردن جلگاؤں، مہاراشٹر

پروین فاروق ضیاء، درجہ: ہشتم، ضلع پریشد اردو اسکول، سبھاش نگر، تعلقہ شیرپور، ضلع دھولیہ، مہاراشٹر

زہرہ جان مخدومی، درجہ: پنجم
الباب میموریل پبلک اسکول، کھریون اننت ناگ، کشمیر

اقرا شیخ عابد، درجہ: ششم، سبھاش نگر، اردو اسکول، مہاراشٹر

فیضانہ شریف کھاٹک، درجہ: ہفتم، سبھاش نگر اردو اسکول، مہاراشٹر

آسمل اختر کھاٹک، درجہ: ہشتم
ضلع پریشد اردو اسکول، سبھاش نگر، تعلقہ شیرپور، ضلع دھولیہ، مہاراشٹر

روزنین الطاف نیار، درجہ: ششم، ضلع پریشد اردو اسکول، سبھاش نگر، مہاراشٹر

تحرین عزیز کھاٹک، درجہ: ہفتم، ضلع پریشد اردو اسکول، سبھاش نگر، تعلقہ شیرپور، ضلع دھولیہ، مہاراشٹر

عرشین صدف یوسف خان، درجہ: ششم
فاطمہ گرلس اردو ہائی اسکول، بیگم پورہ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

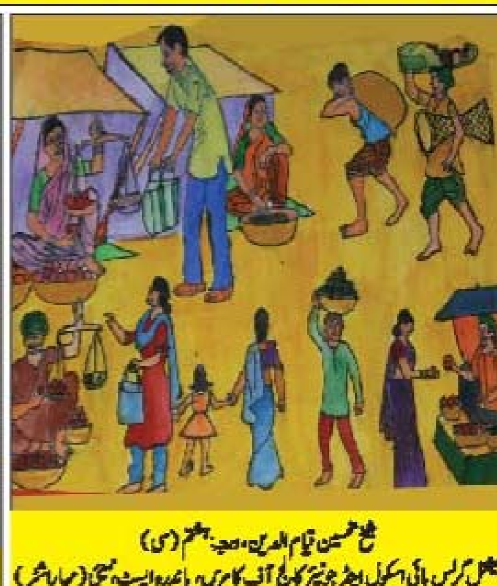

شیخ حسین قیام الدین، درجہ: ہشتم (سی)
نیشنل گرلس ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج آف کامرس، باندرہ ایسٹ، ممبئی (مہاراشٹر)

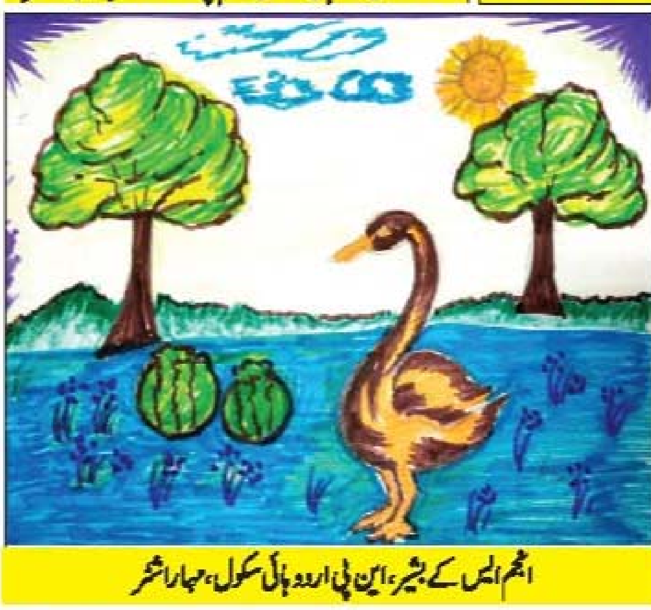

انجم ایس کے بشیر، این پی اردو ہائی سکول، مہاراشٹر

facebook اردو فیس بک

میرا نام محمد اسعد مسعود ہے۔ میں ہارون انصاری اردو پرائمری اسکول میں آٹھویں جماعت میں زیرِ تعلیم ہوں۔ میرے ابو ہر ماہ بچوں کی دنیا گھر پر لاتے ہیں۔ ہم بھائی بہن اس کے دیوانے ہیں اور ایک دن میں پوری کتاب پڑھ ڈالتے ہیں۔ قسط وار ناول 'زمین کی تہہ میں' بہت پسند آیا اور دوسرے مضامین اور کہانیاں، لطائف وغیرہ بھی اچھے ہیں۔ کھانے کی کھیر کہانی بھی اچھی لگ رہی ہے مگر اسے تھوڑا بڑا کر کے شائع کریں۔ اس ماہ کی 30 تاریخ کو میری سالگرہ بھی آرہی ہے۔ اتنا اچھا رسالہ نکالنے پر آپ کو دل کی عمیق گہرائیوں سے مبارکباد۔

محمد اسعد مسعود احمد، قلعہ مالیگاؤں، ناسک، مہاراشٹر

*دل کی گہرائیوں سے سالگرہ کی مبارکباد۔ خدا آپ کو ڈھیر ساری خوشیاں اور کامیابیاں عطا کرے۔ (ادارہ)

مجھے 'بچوں کی دنیا' کی کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ میرے ابو ہر مہینے یہ میگزین لاتے ہیں۔

فرخندہ جبین، درجہ اوّل، نگر پریشد اسکول، ناندورہ، بلڈانہ، مہاراشٹر

میرا نام انشرہ مرزا فاروق بیگ ہے۔ درجہ نہم کی طالبہ ہوں۔ اس ماہ کے 'بچوں کی دنیا' میں آپ کا دماغ کتنا تیز ہے مجھے بہت پسند آیا۔ ساتھ ہی ساتھ دس منٹ میں دس غلطیاں تلاش کرنے میں مجھے بہت مزہ آتا ہے۔ بچوں کی دنیا کا کیا کہنا۔ میں ہر ماہ یہ رسالہ خرید کر پڑھتی ہوں۔

انشرہ مرزا فاروق بیگ، الحسنات اردو ہائی اسکول، رسلپور، مہاراشٹر

'بچوں کی دنیا' جب سے شائع ہورہا ہے تب سے میں ہر مہینے پابندی سے اسے پڑھتی ہوں۔ میں اور میری کزن سحر کتابوں اور رسالوں کے بے حد شوقین ہیں۔ 'بچوں کی دنیا' ہمارا محبوب رسالہ ہے۔ ہم دونوں کو ہی کہانیاں لکھنے کا بہت شوق ہے اور ہماری کہانیاں 'بچوں کی دنیا' کی بھی زینت بن چکی ہیں۔ ہمارے گھر والے ہمارے اس شوق سے بہت خوش رہتے ہیں 'بچوں کی دنیا' کی سبھی کہانیاں اور نظمیں بہت عمدہ ہوتی ہیں۔ خاص طور سے آپ کی 'آپس کی باتیں' بہت اچھی لگتی ہیں۔

طریبہ حیات، درجہ ہشتم، سر اقبال پبلک اسکول، متوناتھ بھنجن، یوپی

میں کہکشاں مسکان انصاری مدرسہ اہلِ سنت فاروقیہ سلطان العلوم کی طالبہ ہوں۔ میرے ابو اور امی ٹیچر ہیں۔ میرے بھائی گیارہویں جماعت کے طالب علم ہیں۔ بھائی نے ہی مجھے پہلی بار 'بچوں کی دنیا' پڑھنے کو دی اور میں نے اسے پورا پڑھا۔ کہانیاں، مضامین اور ہنسی کے غبارے بہت پسند آئے۔

کہکشاں مسکان انصاری ماسٹر محمد ہارون، مومن پورہ، برہان پور، مہاراشٹر

مجھے ماہ اکتوبر کا 'بچوں کی دنیا' بہت پسند آیا کیونکہ وہ بہت ہی خوبصورت رنگوں میں تھا اور اس میں چھپی ساری کہانیاں اور معلومات بھی بہت اچھی تھیں۔ ہمت کی ہمالہ ام الخیر اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ لڑکیاں وہ سب کچھ کر سکتی ہیں جو لڑکے کرتے ہیں۔

عرشیہ بی صابر بیگ، درجہ ہفتم، الحسنات اردو ہائی اسکول، رسلپور، مہاراشٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

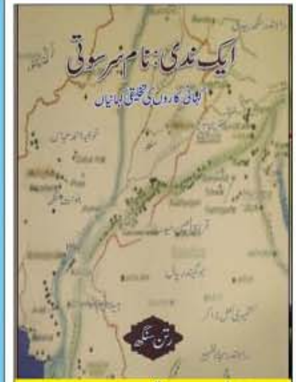

صفحات:319، قیمت:150 روپے

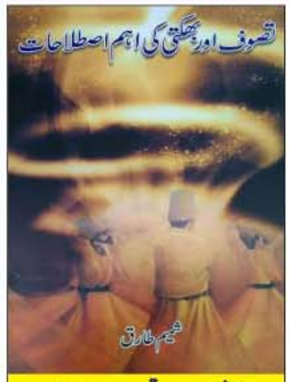

صفحات:411، قیمت:185 روپے

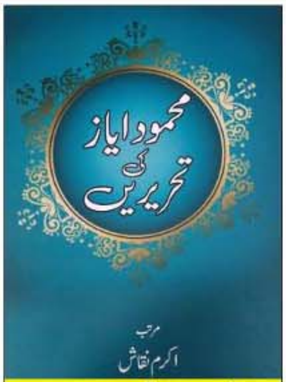

صفحات:619، قیمت:275 روپے

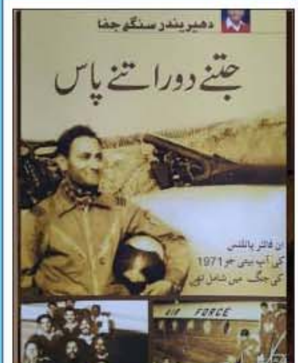

صفحات: 289، قیمت: 140 روپے

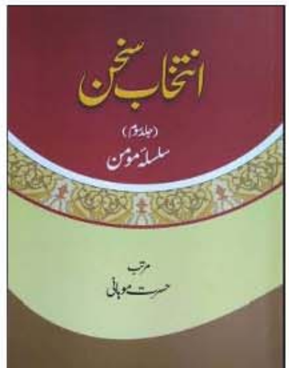

صفحات: 326، قیمت: 155 روپے

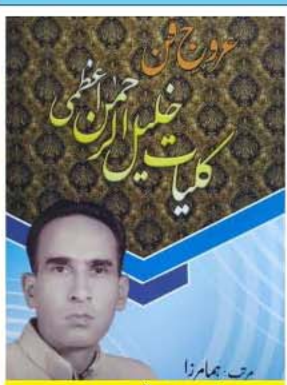

صفحات:260، قیمت:145 روپے

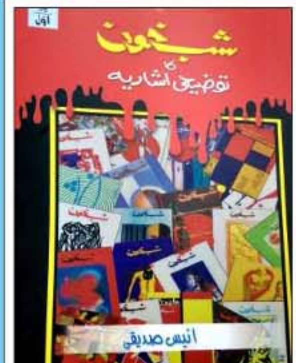

صفحات:1374، قیمت:530 روپے

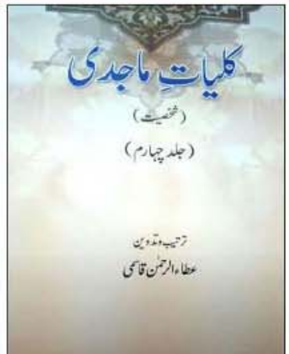

صفحات: 527، قیمت: 230 روپے

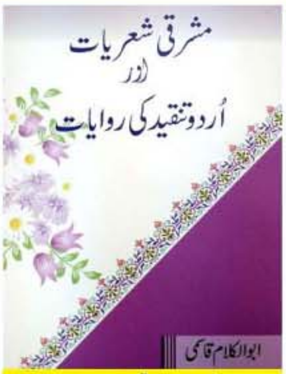

صفحات:382، قیمت: 170 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

BACHON KI DUNIYA Monthly, May 2018, Vol. 06, Issue: 05
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439-2016-18
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/04/18
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دل چسپ کتابیں

صفحات: 112، قیمت: 25 روپے

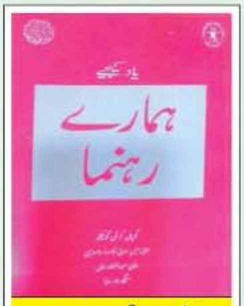

صفحات: 106، قیمت: 35 روپے

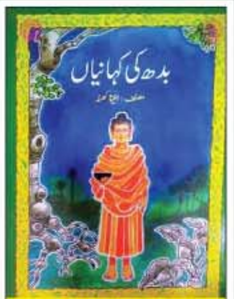

صفحات: 80، قیمت: 65 روپے

صفحات: 80، قیمت: 35 روپے

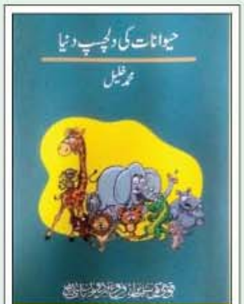

صفحات: 83، قیمت: 24 روپے

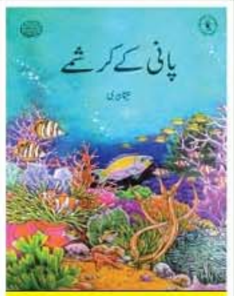

صفحات: 96، قیمت: 70 روپے

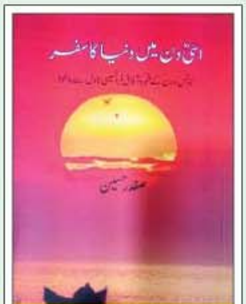

صفحات: 170، قیمت: 35 روپے

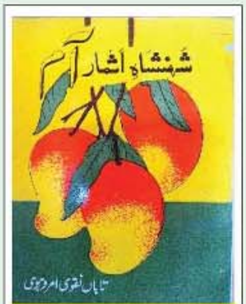

صفحات: 64، قیمت: 11 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.